مخدومی

[ابوالاثر حفیظ جالندھری کے بارے میں]

محمّد طفیل

ادارہ فروغ اُردو ۰ لاہور

مل تو لیجیے کہ بُرا شخص نہیں ہے حفیظ
محض عاشق ہی نہیں شاعرِ مشہور بھی ہے

مخدومی

[ابوالاثر حفیظ جالندھری کے بارے میں]

محمد طفیل

اِدارہ فروغِ اُردو ○ لاہور

بار اوّل : ۱۹۸۳ء

تعداد : ایک ہزار

کتابت : عبدالمتین

قیمت : ۲۵ روپے

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاثر حفیظ جالندھری پر مضمون لکھنے کا ارادہ تھا کتاب ہوگئی۔ آپ سے معذرت خواہ ہوں اور حفیظ صاحب سے شرمندہ ہوں -

اگر میں یہ کتاب لکھ کر سلیم الطبع حضرات سے شاباشی کے سرٹیفکیٹ لیتا یا حفیظ صاحب سے داد وصول کرتا تو آئندہ کے زیرک لوگ مجھے نہ بخشتے۔ کہتے، آدمی کو فرشتہ بنا دیا۔ اب صورت یہ ہے کہ میں کسی حد تک مطمئن ہوں۔ ہم دونوں ہی آدمی ثابت ہوں گے -

حفیظ صاحب پر لکھنا بہت مشکل نکلا۔ کیونکہ میں نے جب بھی یہ چاہا کہ ان کی رنگا رنگ شخصیت کو کاغذ پر بچھا دوں تو مجھے شاہنامۂ اسلام کی جلدیں تھامے، کوئی دوسری شخصیت بھی نظر آتی -ایک کے تقاضے کچھ تھے - دوسری کے کچھ، جب یہ تماشا ختم نہیں ہو رہا تھا تو میں نے چالاکی یہ کی کہ دونوں کو ایک ہی ہستی سمجھ لیا——اور ٹن ٹن گھنٹی بجادی -

ایک طرف میری عقیدت تھی۔ دوسری طرف ان کی پھڑکا دینے والی شخصیت' کیا کرنا کیا نہ کرتا - میں تو لفظ لفظ پریشان رہا۔ اس کے باوجود میں نے لکھا وہی' جو مجھے نقطہ بہ نقطہ لکھنا چاہیے تھا -

غرض ہر قسم کی تحریری احتیاط اور شعوری بے احتیاطی کے باوجود، نہ تو قصور اس گنہگار کا نکلے گا اور نہ حفیظ صاحب کی ذاتِ بابرکات کا، کیونکہ یہ بھی میری اور آپ کی طرح کے عام سے آدمی ہیں جنھیں قدرت نے فضیلت کے پھندنے لگا دیے -

یہ فردوسیِ اسلام ہیں تو بھی میں کیا کروں، جو شخص اپنا کھانا اللہ میاں کے ہاں کھولتا ہے۔ اُس کا انعام بندہ دے بھی کیسے سکتا ہے ؟

محمد طفیل

۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء

O

میں نے حفیظ صاحب پر یہ چند صفحات ۱۹۷۱ء میں لکھے تھے۔ مزید کچھ لکھنے کا ارادہ تھا مگر مہلت نہ ملی۔

حفیظ صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ اس پر وہ تبصرہ کریں گے جو میرے لکھے ہوئے ہر باب کے بعد چھپے گا۔ میں نے بھی سوچا، کتاب دوآتشہ ہو جائے گی۔ (دیکھئے حفیظ صاحب کی وجہ سے دوآتشہ)

بات آج کل پر ٹلتی رہی۔ کتاب کی اشاعت معلق رہی۔ اب جب کہ کتاب کے دوآتشہ ہونے کا امکان نہیں رہا۔ یعنی اپنے حفیظ صاحب ہی اس دُنیا سے چلے گئے تو میں نے مناسب سمجھا، کتاب چھاپ دی جائے۔

سات آٹھ برس کی بات ہے کہ حفیظ صاحب نے، مجھے اپنے ایک عزیز کے ذریعہ پیغام بھیجا" طفیل سے کہو کہ کتاب چھاپ دے۔ اگر وہ میرے مرنے کا انتظار کر رہا ہے تو میں نہیں مروں گا۔"

حفیظ صاحب کا فقرہ سچا ہے۔ کیونکہ حفیظ زندہ شاعر ہے!

۲۰، جولائی ۱۹۸۲ء

محمد طفیل

میں جتنے جتنی شخصیت طرازی میں ثناطرازی کرتا ہوں، اُتنے جتنی ثناطرازی میں شخصیت طرازی کے نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں پشیمان اور میرے ممدوح پریشان ہو جاتے ہیں۔ یوں حیرت سامانی میرے حصے میں آتی ہے اور حیرانی میرے ممدوح کے حصے میں، ہم دونوں میں سے سچا کون ہوتا ہے۔ یہ آج تک کسی نے نہیں بتایا۔ بادش بخیر! میں آج مضمون حفیظ جالندھری کے بارے میں لکھنے لگا ہوں جو شاعر ہیں۔ اس لیے میرے مضمون میں جہاں "شاعری" در آئے، اُسے میرا عجز جانتے کے ساتھ ساتھ، حفیظ صاحب کے کمالات کا پرتو بھی سمجھیے گا۔ یوں تو میں نے اور شاعروں پر بھی مضمون لکھے۔ لیکن میں نے اُن میں شاعری کو کم سے کم داخل ہونے دیا۔ آج میری وہ اکڑ فوں بھی نکل جائے گی۔ اس لیے کہ حفیظ صاحب کی زندگی

٭ پیدائش ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء

جیسے ان کی شاعری سے ملوث ہے اور کسی شاعر کی نہیں ۔
قدرت جب کسی کو نوازتی ہے تو وہ ذات پات اور حسب نسب نہیں دیکھتی ۔
اگر قدرت کے ہاں اس قسم کا التزام ہوتا تو حفیظ جالندھری، حفیظ تو بے شک ہوتے
لیکن خان بہادر نہ ہوتے ۔ حسان الملک نہ ہوتے ۔ فردوسیٔ اسلام نہ ہوتے ـــــ
راجپوت خاندان کا ایک فرد اُڑتا بھی کہاں تک ؟

یہ وہی صاحب ہیں جن کے احترام میں پوری قوم کو کھڑا ہونا پڑتا ہے ۔ یعنی
ان کا ترانہ اگر کھڑے ہو کر نہ سُنیں تو غیر مہذب کہلائیں ۔ مارشل لا لگا ہُوا ہو تو
سزا الگ کاٹیں ۔

ایک دن فرمانے لگے ۔ "میں دو تین مرتبہ آیا مگر تجھ سے ملاقات نہ ہوئی ۔"
"میں یہاں نہ تھا، آپ کے سُسرال گیا ہُوا تھا ۔"
"جالندھر ؟"
"نہیں لندن !"
[ان کی ایک بیوی انگریز بھی تھیں ۔ اس لیے میں نے لندن کو ان کا سُسرال کہا]
"اچھا اچھا ! ـــ بتاؤ اب اُس قوم کا کیا حال ہے ؟"
"آپ نے تو اُس قوم کو خوب ٹھونک بجا کے دیکھا ہے ۔ اس لیے مجھ سے
کیا پوچھتے ہیں ؟"
"جب میں لندن گیا تھا ۔ اُن دنوں وہ قوم صاحب کردار تھی ۔ چاروانگ

دھوم تھی۔ وہ محاورہ کہ اُن کی سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ سچ تھا۔ مگر اب سُنا ہے کہ وہ قوم حد درجہ تنزل کا شکار ہے۔ غنڈہ گردی، ہلڑ بازی ان کا شیوہ ہے۔ ہر اخلاقی گراوٹ آرٹ ہے۔ کیا یہ سچ ہے ؟"

"سچ ہے"

"اگر یہ سچ ہے تو پھر کوئی اور بات کرو"۔

حفیظ صاحب نے اپنے حالات اپنی مختلف کتابوں میں لکھے ہیں۔ جو باتیں لکھ چکے ہیں انھیں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق سہی، لیکن کچھ نہ کچھ دہراؤں ضرور!

حفیظ صاحب کہتے ہیں کہ چند لڑکے بالے کرکٹ کھیل کر واپس آ رہے تھے کہ ایک حویلی میں واہ وا سبحان اللہ کا شور سُنا۔ ہم بھی وہاں جاکے بیٹھ گئے۔ جب وہ کہتے۔ سبحان اللہ! ہم بھی کہتے سبحان اللہ۔ جب وہ کہتے واہ وا، ہم بھی کہتے واہ وا۔ اس صورتِ حال سے سامعین بدمزہ ہوئے۔ انھوں نے ڈپٹ کر کہا "نکل جاؤ یہاں سے"۔ چونکہ بچپن میں پیار سے کہی ہوئی بات سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن غصّے سے کہی ہوئی بات سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے ڈٹے رہے۔ جب اُنھوں نے دوبارہ کہا "نکل جاؤ یہاں سے"۔ میں نے کہا "نہیں جاتے"۔ اس پر اُنھوں نے ٹھکائی کردی۔ سر پھٹ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جو شخص پگڑ باندھے شعر پڑھ رہا تھا۔ وہ مولانا گرامی تھے۔

میرے استفسار پر اُنھوں نے بتایا کہ میں نے پہلا شعر جو کہا تھا۔ وہ یہ تھا۔

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار
تو نگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار

یہ بھی فرمایا کہ جب میں نے بارہ برس کی عمر میں پہلی غزل کہی تو دوستوں نے مشورہ دیا کہ کسی اُستاد کو بھی پکڑوں۔ ورنہ شتر بے مہار ہو جاؤ گے۔ چنانچہ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق شیر شاہ اسد نامی ایک شخص سے غزل پر اصلاح لی۔ اُس نے میرے اشعار بے وزن کر دیے۔ مجھے تاؤ آگیا، تکرار بڑھی تو میں نے اُس کی ہجو لکھ ڈالی جس کے دو تین مصرعے اب بھی یاد ہیں۔

یہ مہرباں کو نحرباں بناتے ہیں
ساتھ ہی وہ ہمہ داں ہونے کی بھی کد کرتے ہیں
شیر شاہ نام تخلص وہ اسد کرتے ہیں

لیجیے جتنا میں نے تکرار ہی گناہ کا مرتکب ہونا تھا۔ ہو لیا۔ آپ اب اپنے ڈھب سے باتیں کریں۔ اللہ توفیق دے۔

تذکرہ شعرائے پنجاب میں، ان کا سن پیدائش ۱۸۹۹ء لکھا ہوا ہے۔ یہ خود ۱۹۰۰ء بتاتے ہیں معلوم نہیں عمر کم بتانا حصۂ خواتین والی بات ہے یا یہ کہ پیدائش ہی ایک سال بعد کی ہے۔ بہر حال یہ ایک سال پہلے پیدا ہوئے ہوں یا بعد میں، کوئی فرق نہ پڑے گا۔ چہرے سے پہ جھریوں کے آثار ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہہ دیں "ابھی تو میں جوان ہوں" تو میں یا آپ کیا کر سکتے ہیں۔

سن پیدائش کے سلسلے میں مہینہ کا تعین یوں کرتے ہیں:" غالباً مہینہ رمضان ہی کا ہوگا جبھی تو فاقے کر رہا ہوں"۔

میرا دل چاہتا ہے کہ فاقوں والی بات پر بھی چند جملے کہہ دوں۔ یہ بھی غالباً میری طرح کے لوگوں میں سے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مرگئے، مرگئے۔ کچھ نہ ملا۔ یہ صحیح ہے کہ جگہ ضرور نہیں پوری نہیں ہوتیں۔ آسودگیاں منہ چھپائے پھرتی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی "دشمن" یہ بھی کہہ سکتا ہے۔ مزے میں ہیں اور کیا چاہیے؟ یہی میں حفیظ صاحب سے کہتا ہوں۔ جناب اور کیا چاہیے؟

حرص صرف حفیظ صاحب ہی کے حصّے میں نہیں آئی۔ دُنیا کے ننانوے فی صد لوگوں کے حصّے میں آئی ہے۔ یہ اپنی شاعری کے اعتبار سے، دو ایک فیصد لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن حرص کے اعتبار سے عام سے آدمی ہیں۔ قناعت بڑی دولت ہے مگر یہ دولت کبھی بھی گنہگاروں کے حصّے میں نہیں آئی۔

ایک دن حفیظ صاحب تشریف لائے تو میں اپنے ایک ضروری کام میں منہمک تھا۔ پہلے تو میں چپکے سے اپنا کام کرتا رہا پھر سوچا۔ یہ زیادتی ہے۔ مخاطب کر کے پوچھا:" اگر آپ اجازت دیں تو دو ایک منٹ میں اپنے اس کام سے نپٹ لوں؟"

" ضرور، میرا بھی سانس پھولا ہوا ہے۔ بولنے کی سکت نہیں"۔

گفتگو یا انداز گفتگو کسی بھی شخصیت کا وہ نقاب ہوتا ہے جو بغیر تکلم کے پردۂ اخفا میں رہتا ہے۔ یعنی گفتگو شخصیت کا قفل ہے جو زبان کی چابی سے

کھُل سکتا ہے۔ قفل کھلنے کے بعد، جو کچھ سُننے میں آتا ہے اس لہجے کو اندازِ گفتگو کا نام دیا گیا ہے۔

چنانچہ میں نے کام سے فارغ ہو کر پوچھا "کیسے ہیں ؟"

میرے استفسار پر بولے کچھ نہیں۔ انگلی سے سر کی طرف اشارہ کر کے کچھ سمجھانا چاہا۔ مگر میرے پلّے کچھ نہ پڑا۔

"کیا ہوا سر کو ؟"

" یہ ! "

" یہ کیا ؟ "

" یہ ! "

" جناب یہ کیا ؟ "

" یہ سر ہے "

" جی ہاں سر ہے "

" یہ اب کام نہیں کرتا۔ یادداشت جاتی رہی ہے " [پھر انگلی کے اشارے کے ساتھ] ــــ یہ ــــ یہ ــــ یہ ــــ بالکل کام نہیں کرتا " [یہ لمبی استفہامیہ مسکراہٹ، جس میں چہرے پر، منہ کا بایاں حصّہ نمایاں کردار ادا کرتا ہے]

حفیظ صاحب کی گفتگو کا ایک خاص انداز ہے۔ جو انہی سے مخصوص ہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک جملہ ادا کریں گے تو دوسرا جملہ کہنے کے درمیان اپنی ایک

خاص مسلسل مسکراہٹ کو جامد کر دیں گے۔ اس کے ساتھ دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے
ایک خاص قسم کا زاویہ بنائیں گے۔ پھر انھیں ذرا ذرا سا اِدھر اُدھر کر کے، ان سے
وہ کام لیں گے کہ مخاطب پہ معاملے کی جُملہ نزاکتیں واضح ہوجائیں گی۔ بعض اوقات
بیر ہوتا ہے کہ یہ مسکرائیں گے۔ مخاطب سمجھے گا کہ مسلسل مسکراتے رہیں گے مگر یہ جھکہ
دے جائیں گے۔ ذرا سا ہنس کر ایک دم سنجیدہ ہوجائیں گے۔ اِتنا سنجیدہ کہ مخاطب
ہکا بکا رہ جائے۔ مطلب یہ کہ ان کی گفتگو میں الفاظ کا استعمال کم سے کم ہوتا ہے
منہ کا اور ہاتھ کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ خوبی ایسی ہے جو میں نے
کسی اور میں نہیں دیکھی۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ گفتگو فرما رہے ہیں۔ اور گفتگو میں طوفان بنے ہوئے
ہیں۔ یعنی جو کہنا چاہ رہے ہیں۔ کہہ نہیں پا رہے۔ ایسے میں ایک دم اُٹھ کر کھڑے
ہو جائیں گے اور کھڑے ہو کر اکڑ جائیں گے۔ اس کے بعد مخاطب سے آنکھیں چار
کریں گے۔ پھر ایک دم چل دیں گے اور مجھ ایسا عقیدت کا مارا منہ تکتا رہ جائے گا
یعنی جب ہاتھ اور منہ سے تکلّم کا کام نہ لیں گے تو پھر ہمارے ساتھ یہ سلوک کریں گے
یہ ادا و انداز بھی انہی کا حصّہ ہے۔ انہی سے مخصوص!

ایک دن میری بیوی دفتر میں بیٹھی ہوئی تھیں کہ یہ تشریف لے آئے۔ میں
نے جلدی سے تعارف کرا دیا۔ تاکہ کوئی ایسی بات نہ کر دیں کہ بعد میں بیوی کو سمجھانا
مشکل ہو جائے۔

" یہ میری بیوی ہیں ــــ اور ــــ یہ حفیظ جالندھری ہیں "
دونوں نے مسکرا کر، بغیر کچھ کہے، اپنی اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ مگر یہ جو مسکرانے پر آتے ہیں تو تواتر کے ساتھ ایسا جم کے مسکراتے ہیں کہ دوسرا ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ پہلے تو میری بیوی حفیظ صاحب کے مُنہ کی طرف دیکھتی رہیں۔ جب ان کا مسکرانا ختم نہ ہوا تو میری طرف دیکھنے لگیں اور میں ان دونوں کی طرف دیکھ دیکھ کر کچھ لطف اندوز ہوتا رہا۔ کچھ جھینپتا رہا۔
اچھی خاصی لمبی مسکراہٹ کے بعد حفیظ صاحب نے اُونچی آواز میں فرمایا۔
" بیٹی! "
" جی! "
" بے ٹی "
" جی! "
" یہ طفیل بڑا بدمعاش ہے "
اب میرا اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے، اس لیے کہ بیویاں تو اچھے بھلے شوہروں کے سلسلے میں بھی طرح طرح کے وسوسوں میں گرفتار رہتی ہیں۔ پھر جب انھیں ایسی معتبر شہادت ملتی ہو تو وہ کیوں نہ معنی خیز انداز میں سر ہلائیں چنانچہ سر ہلا اور میری جان گئی۔ سوچا، آج رات جنگ جدل ہی میں گزرے گی۔ چنانچہ حواس بجا کر کے کہا "حفیظ صاحب! میری بیوی، میری بدمعاشیوں کی تفصیلات

جان کر خوش ہوں گی ۔ بارے بیان ہوجائے ۔"

" بیٹی اس جیسا محنتی آدمی میں نے نہیں دیکھا ۔"

میری بیوی، میری تعریف سُننے کے مُوڈ میں نہ تھیں۔ بلکہ معاملے کی کھوج کا موڈ وارد ہوچکا تھا۔ "کیا کیا کرتے ہیں ؟"

" بدمعاشی ایسے سلیقے سے کرتا ہے کہ سب واہ وا کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔"

" مثلاً ؟"

" واہ وا !"

میری بیوی جلد سے جلد میرے اُلجھنوں سے آشنا ہونا چاہتی تھیں۔ ادھر جو کچھ حفیظ صاحب کے دل میں تھا۔ زبان پر نہیں آرہا تھا۔ زبان ہل رہی تھی مگر لفظ ادا نہیں ہورہے تھے ۔ اسی لیے بیوی نے کچھ بے تابی ہی سے کہا "کچھ بتاتے تو ہیں نہیں ۔ خواہ مخواہ ـــــ"

" واہ وا ۔"

اب پھر میری بیوی نے ، میری طرف دیکھنا شروع کر دیا ۔ جیسے کھا رہی ہوں "جیسا تُو ہے ویسے ہی تیرے دوست ہیں ۔ یعنی معنے !" تھوڑی دیر تذبذب میں گزری ۔ اس کے بعد حفیظ صاحب نے فقرے اُنڈیل دیے۔" اس نے غزل نمبر چھاپا۔ اُس میں اساتذہ کا کلام بھی چھاپا ۔ مبتدیوں کا کلام بھی چھاپا۔ سب کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا۔ اب میں میرؔ کے سامنے غزل پڑھ رہا ہوں، میرؔ میرے سامنے پڑھ رہا ہے، غالبؔ

مومن کے سامنے غزل پڑھ رہا ہے۔ مومن غالب کے سامنے پڑھ رہا ہے۔ اسی طرح سب کے سب ایک دوسرے کے سامنے پڑھ رہے ہیں۔ اب اس ایک نمبر کے ذریعہ سب کو اپنی اپنی قیمت معلوم ہو جاتی ہے۔ اب ان میں کوئی شاعر خفیف ہو رہا ہے، کوئی خوش ہو رہا ہے۔ کوئی تن رہا ہے۔ کوئی "بھُس" رہا ہے۔ یہ بدمعاشی نہیں تو اور کیا ہے؟"

حفیظ صاحب، کا ابتدا میں اُٹھنا بیٹھنا عام لوگوں کے ساتھ ہی تھا۔ کسی پھل فروش کے ساتھ، کسی تندور یئے کے ساتھ، کسی حجام کے ساتھ، غرض زیادہ تر یاری نچلے طبقے کے ساتھ تھی اور یہ بات ان کے فن کے لیے مفید بھی ثابت ہوئی۔ انھوں نے زندگی کی عکاسی، عوامی سوچوں سے ہم کنار ہو کر کی اور عوام کے لیے کی۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے عوامی شاعر یہ ہیں اُتنے فیض احمد فیض بھی نہیں۔ فیض بے شک عوام کے لیے لکھتے ہیں مگر ان کی شاعری عوام کے لیے نہیں ہے۔

حفیظ صاحب کے بچپن کے ساتھیوں میں، ایک پھل فروش، پچھلے دنوں تک لاہور میں شملہ پہاڑی کے قریب پھل بیچا کرتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ فیجے کے (حفیظ کے) نانا مال دار تھے۔ اُنھوں نے فیجے کو متبنیٰ بنایا ہوا تھا اور فیجا کبھی کبھی نانا کی دولت پر ہاتھ صاف کیا کرتا تھا۔ جو کچھ اس کے ہاتھ لگتا۔ لے آتا اور ہم سب مل کر گلچھرّے اڑاتے۔

جب ایک موقع پر فیجے کے ہاتھ روپے لگے تو ہم سیر سپاٹے کی غرض سے

لاہور کی طرف چل دیے۔ ہم مال روڈ پر جا رہے تھے۔ دیکھا تو فیجا غائب، لوٹ کر دیکھا کہ فیجا ایک جگہ بیٹھا رو رہا تھا۔

ہم نے پوچھا: "رو کیوں رہے ہو؟"

فیجے نے کہا: "یہاں سے سڑک پار کرتے ہوئے، ایک موٹر سوار نے، موٹر میں سے پورے دھکا دیتے ہوئے کہا "اندھے ہو؟"

"جب سے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اندھا وہ تھا یا میں ہوں؟ وہ شاید آنکھوں والا اس لیے تھا کہ اس کے پاس موٹر تھی اور میں اندھا اس لیے ہوں کہ پیدل چل رہا ہوں۔"

ابتدائی زندگی میں، یعنی آوارہ گردی کے دور میں، انھوں نے کپور تھلہ میں ایک بیٹھک کرایہ پر لے رکھی تھی۔ چند دوست اکٹھے ہو کر دھما چوکڑی مچایا کرتے تھے۔ خوب ہا ہا ہُو ہُو ہُوا کرتی تھی۔ گانے ہوتے تھے، گالی گلوچ ہوتی تھی۔ حقہ پینے والے حقہ پیا کرتے تھے۔

ان کی بیٹھک کے ساتھ سکھوں کا گھر تھا۔ وہ ہا ہُو تو برداشت کر رہے تھے مگر اُن سے ان کا حقہ پینا برداشت نہ ہوا۔ انھوں نے شکایت کی: "مہاراج! گائیے، شور مچائیے مگر حقہ نہ پیجیے۔"

جب سردار صاحب نے چنڈال چوکڑی سے بات کی تھی اس وقت یہ موجود نہ تھے۔ انھوں نے سنا تو کہا۔ کوئی بات نہیں، ہم اس کا علاج کرتے ہیں چنانچہ انھوں نے ایک بانی لکھی۔ اُسے اُونچے سُروں میں گایا۔ پھر گایا۔ نیچے لوگ اکٹھے

ہو گئے جو محظوظ ہوئے ۔ چنانچہ سردار صاحب دوبارہ ان کے پاس پہنچے اور کہا ۔
" مہاراج ہم آپکے ہمسائے ہیں ۔ ہمارا بھی آپ پر کچھ حق ہے ۔ مہاراج اور سب کچھ
کیجیے ۔ بے شک حقہ بھی پیجئے ۔ مگر یہ بانی نہ گائیے "

وہ بانی یہ تھی :

نائیا تجھ بن کون کرو
کون کرو بھٹی ہولا پار
نائیا تجھ بن کون کرو

لپ لپ جُوآں سر وچ ساڈے
ریکھاں نے لکھ ہجار ۔ تے نائیا تجھ بن
کون کرو ہولا پار
اُمنزرے قینچیاں ، پاس نہ ساڈے
اچھا اوے رب کرتار
نائیا تجھ بن کون کرو ہولا پار

ایک بانی اور بھی تھی جو کہ حفیظ صاحب نے مجھے سنائی تھی ۔ افسوس کہ میں اسے
نقل نہیں کر سکتا ۔ تصور کر لیجیے کہ اس معاملے میں انھوں نے نظیر ، جرأت ، انشا
اور رنگین تک کو پیچھے چھوڑ دیا تھا ۔ سچ کہتا ہوں کہ یہ کسی بھی معاملے میں کسی سے

بیٹھے نہیں ۔

میں نے ایک آپ بیتی نمبر بھی چھاپا ہے ۔ اس کے لیے تمام نامور لکھنے والوں سے درخواست کی تھی کہ اپنی اپنی آپ بیتی سے نوازیں۔ خوب خوب آپ بیتیاں آئیں۔ جو جو جس نے چاہا ۔ وہ وہ لکھا ۔ ہاتھ کون روکتا ۔ مگر حفیظ صاحب کی بیتی سب سے مختلف تھی ۔ اوروں کی اپنی اپنی مدح ہیں ، ان کی اپنی قدح ہیں ہیں حیران ، یہ حوصلہ! حفیظ صاحب کا خیال ہے ۔ سوانح جمع ہے سانحہ کی ، اس لیے سوانح لکھنے کی نوبت آئے تو صرف سانحات کا ذکر ہونا چاہیے ۔ چنانچہ انھوں نے آپ بیتی نمبر میں ایک واقعہ لکھا ہے جس کی تفصیل میں جانا مناسب نہ ہوگا ۔ لیکن مختصر ذکر بہر طور اس ضمن میں لابدی ہے ۔

دو بھائی جوان کے کلاس فیلو تھے ۔ اُن کی شادی ایک ہی دن ہونا قرار پائی تھی ۔ وہ بھی ان کی دونوں خالہ زاد بہنوں سے ، جس طرح بھائیوں کی عمروں میں ایک سال کا فرق تھا ۔ اُسی طرح دُلہنوں کی عمروں میں بھی کم و بیش کچھ ایسا ہی فرق تھا ۔ بھائیوں نے ان سے کلاس فیلگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارا سہرا لکھ دیجیے ۔ جسے انھوں نے منظور کر لیا تھا ۔ یہ بات اُس دَور کی ہے کہ جب حفیظ صاحب اچھے خاصے شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے بلکہ ایک رسالے (اعجاز) کے ایڈیٹر بھی تھے ۔

ان کی نظر میں ذوقؔ و غالبؔ کے سہرے بھی تھے اور یہ اُن سے بڑھ کر

سہرا کہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اختراع یہ کی کہ دونوں بھائیوں کا ایک سہرا لکھا۔" چونکہ دونوں کے چہروں پر چیچک کے بھرپور داغ، رخساروں کی جلد کی تہہ میں اندرون تک معمور یا مامور تھے۔ بیں نے ان کو کھلے آدھ کھلے نمایاں پھول بنایا اور الف اور ب کی ت ث آں دیکھی دلہنوں کی تصوری گل رخساری کے عکس بنا کر اس ایک ہی سہرے میں پرو کر سجا دیا۔ دونوں کی ناکیں اس سہرے کے چہرے پر شاہانہ گل بتیں اور دونوں دولہاؤں کے منہ آدھ کھلے گلابی غنچے وغیرہ وغیرہ!

مجھے یقین تھا اور ہیں الفاظ کو کاغذ پر لاتے ہوئے وجد میں تھا کہ سہرا نویسی کی تاریخ قدیمہ میں چیچک قسمے کی کلیاں اور غنچے پہلی مرتبہ میں نے ہی بنا ڈالے ہیں۔ ان دو سگے دولہا بھائیوں اور دو سگی بہنوں کو جو آج کی رات سے بیویاں بن رہی تھیں۔ ازاں دم تا ایں دم کسی شاعر نے ایسا اکلوتا تحفہ پیش نہیں کیا ہوگا۔"

انھوں نے نہ صرف سہرا لکھنے پر پورا زور باندھا تھا بلکہ خود بھی خوب بن ٹھن کے پہنچے تھے۔ جیسے آج دوستوں سے اپنی بڑائیوں کا اقرار کرا کے ہی لوٹیں گے۔ اعلان ہوا حفیظ بھائی سہرا پڑھیں گے۔

انھوں نے ایک شعر پڑھا۔ کسی نے نوٹس نہ لیا، دوسرا شعر پڑھا کسی نے نوٹس نہ لیا، تیسرا شعر پڑھا کسی نے نوٹس نہ لیا تو یہ بڑے پریشان ہوئے۔ کیونکہ یہ تو مشاعروں میں واہ وا اور سبحان اللہ سننے کے عادی تھے۔ یہاں عالم ایسا تھا کہ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ شیخ برادری کے براتی جیسے ان کی آفاقی واردات پر کھٹے بکّے

ان کا منہ تکنے کی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ بالآخر سکوت ٹوٹا۔ وہ اس طرح کہ ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ آواز ایسی تھی کہ جیسے کوئی مُرغی اپنے دبے ہوئے حلق سے قُت قُت قُت قُت قو قو کر رہی ہو اور لوگ تھے کہ بے حال، اپنی ہنسی کو ضبط کرنے کے لیے، اپنے اپنے رومال منہ میں ٹھونس رہے تھے اور یہ تھے کہ سہرا پڑھ رہے تھے اور اُدھر قُت قُت قُت قُت!

کچی عمر میں انھوں نے بڑے دُکھ اُٹھائے۔ مزدور بن کو مزدوری کی، درزی بن کر کپڑے سیئے، عطر فروش بن کو عطر بیچا۔

مزاج تو ان کا لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں سے عطر بِکے کیسے؟ جب کہ خریدار کو، خود بدبہتہٗ پیش کرنے کی خواہش نے ان کا دیوالہ نکال رکھا ہو۔ یوں وہ ہزاروں روپوں کی رقم، جو ان کے نانا نے، ان کے لیے خرچ کر کے انھیں برسرِ روزگار کرنا چاہا تھا، وہ ان کی عاشقی کے ہاتھوں غارت ہوگئی۔ چنانچہ ایک دن ان کے اور نانا کے درمیان حساب فہمی ہوئی۔

"میں نے تجھے ہزاروں روپوں کا عطر ڈال کے دیا تھا۔ وہ کیا ہُوا؟"

"بِک گیا"

"پیسے کہاں ہیں؟"

"کسی نے دیے نہیں"

"دیے نہیں یا لیے نہیں؟"

" دیے نہیں "

"میں نے تو سنا ہے کہ تم لڑکیوں کو عطر ، خود ہی تحفتہً دیا کرتے تھے"

" میں ہر لڑکی کو تو نہیں دیتا تھا "

" پھر ؟ "

" جسے جی چاہتا تھا "

یہ اچپل بھی بہت ہیں ۔ زندگی کو سہانا پن دینے کے لیے ، یہ ایسی شرارتوں سے بھی باز نہیں آسکتے جن میں خواہ ان کی کتنی ہی ہنسی کیوں نہ ہو ۔ ان کے ساتھیوں میں ہری چند اختر بھی ایسے ہی تھے ۔ سلطان کھوسٹ تو شیطانوں کے امام تھے ۔

ایک بار یہ ہوا کہ گرمیوں کی ایک دوپہر میں ، یہ تینوں چپسکڑا مار کر ، تپتی زمین پر بیٹھ گئے ۔ اوّل تو راہ گیر اسی بات پر حیران تھے کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو یوں چپ چاپ جلتی زمین پر بیٹھے ہیں ۔ پھر گیان دھیان کے سے انداز میں ، اپنی اپنی انگلیوں کو مُنہ پہ رکھے اور منہ اور انگلیوں کے رُخ کو آسمان کی طرف اُٹھائے ہوئے ۔ محویت ایسی کہ جیسے یوں کرنا ان کی تپسیا کے لیے ضروری ہی ہو ۔ جو بھی دیکھتا ، حیران ہوتا اور حیران ہو کر کھڑا بھی ہو جاتا ۔ ہوتے ہوتے سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے ۔ سب ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے " یہ کیا ہو رہا ہے ۔ یہ کیا بات ہے ؟ "

جب اُنھوں نے دیکھا کہ بھیڑ کافی جمع ہو گئی ہے ۔ یعنی بیوقوفوں کا مجمع کافی ہو گیا ہے تو یہ تینوں ایک دم ٹھٹھا مار کر اُٹھے اور ہنستے ہنستے بھاگ نکلے ۔ یہ

جا وہ جا ! لوگ جبران پہ مسرور، لوگ کہیں ہم نے تین بے وقوفوں کو دیکھا۔ یہ کہیں ہم نے سینکڑوں بے وقوفوں کو دیکھا۔

ایسی ہی اچپلی ہیں، انھوں نے ایک بار، اپنے ایک دوست سے شرط یہ لگائی۔ اگر تم مجھے ایک سو روپیہ دو تو میں انار کلی بازار سے، تمام کپڑے اتار اور صرف ایک لنگوٹی لٹکا کر گزر جاؤں گا۔ بات پکّی ہو گئی۔ اُدھر انھوں نے ایک سو روپیہ کا نوٹ، بطور ضمانت دوسرے صاحب کو دے دیا۔ اِدھر انھوں نے کپڑے اُتارنے شروع کر دیئے۔ انھوں نے جتنے کپڑے اُتارے، اُتنے پر ہی دوست نے سو روپیہ کا نوٹ ان کے حوالے کر کے شرط ہارنے کا اعلان کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہارنے والے دوست نے کہا "مجھے اپنی شرط کے ہارنے کا افسوس نہیں، جتنا کہ اس امر کا کہ آپ تو عجیب آدمی ثابت ہوئے "

" میں عجیب نہیں بلکہ تم بیوقوف ہو "

" وہ کیسے ؟ "

" میں تو تمھارے حُمق سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ سو وہ اُٹھا لیا "

" کیسے ؟ "

" وہ ایسے کہ مجھے یقین تھا کہ تم میرے عمل کے ابتدائی مرحلے میں ہی، میدان چھوڑ کے بھاگ جاؤ گے۔ سو وہی ہُوا "

جب اچپلی ہی کے قصّے چل نکلے ہیں تو ایک بات اور بھی سُن لیں۔ وہ یہ

کہ اگر یہ کسی امیر آدمی کو دیکھتے تو یہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیتے۔ وہ بھی یوں کہ پاؤں کے ساتھ پاؤں اور قدم کے ساتھ قدم ملا کر، یوں چند قدم چل کر آہستہ سے کان میں کہتے "ابے آہستہ چل!"

وہ ان کے رویّہ اور اندازِ تخاطب پر، پہلے تو خاموش زبان میں، صرف اپنے تیوروں ہی سے ناراض ہوتا۔ مگر ان کا عمل اپنی جگہ جاری رہتا۔ چپکے سے کہہ دیتے "ابے تجھے کہا ہے۔ آہستہ چل!"

اب وہ امارت کا مارا، جب اپنی یوں تذلیل ہوتے دیکھتا تو گالیوں پر اُتر آتا۔ تب یہ مطمئن ہوتے، جیسے خواہش پوری ہو گئی ہو۔ بازی جیت لی ہو۔

آپ کو مندرجہ بالا باتیں آتنی تقدس مآب شخصیت کے سلسلے میں عجیب سی معلوم ہوتی ہوں گی مگر مجھے یہ عجیب نہیں لگتیں۔ اول تو انسان جس چیز کا نام ہے وہ اپنے ایسے ہلکے پُھلکے تفریحی مُوڈوں سے ہی ہویدا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو ہمہ وقت بقراط بنا رہتا ہے۔ وہ اور تو سب کچھ ہو گا مگر وہ پورا شخص نہ ہو گا۔

ایک دن حفیظ صاحب تشریف لائے۔ دیکھا تو ان کی انگلی کٹی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا "خیریت؟"

کہنے لگے "حجامت کرتے ہوئے کٹ گئی"

"اپنی یا دوسروں کی؟"

"اپنی"

"افسوس!"

افسوس والی کوئی بات نہیں، شعر سنو ؎

حضرتِ حجام سب کا مونڈتے پھرتے تھے سر

آج اُس کو چپے میں اُن کی بھی حجامت ہوگئی

حفیظ صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ آپ کے ہر سوال کے جواب میں ایک شعر پڑھ سکتے ہیں۔ اگر کسی کا شعر یاد نہ آئے تو اپنا ہی شعر پڑھ دیں گے۔ زیادہ تر انھیں دوسروں کے اشعار یاد نہیں آتے۔ اس لیے اپنے ہی شعر پڑھتے ہیں مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مندرجہ بالا شعر ان کا نہیں۔

ہم ایک دن کھانا کھا رہے تھے کہ حفیظ صاحب تشریف لائے۔ فرمایا کہ "السلام علیکم کے بعد عرض یہ ہے کہ بندہ نے بھی کھانا کھانا ہے۔" ظاہر ہے کہ ہمارے لیے سعادت کی بات تھی۔ ہم نے کہا "بسم اللہ!"

وہ دن گوشت کے ناغہ کا تھا اور میرے ایک نہایت ہی عزیز دوست کراچی سے آئے ہوئے تھے۔ اس لیے دوست داری میں سوچا تھا کہ محض دال روٹی سے دوست کو تنانا یا ٹرخانا مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے میں نے بازار سے چرغا بھی منگوا لیا تھا۔ تاکہ غربت اور امارت بھی ہم شیر وشکر ہوں۔ کیونکہ میرا دوست ایک بڑا افسر تھا اور میں غریبا مئو کلاس سے، چنانچہ حفیظ صاحب نے بیٹھتے ہی کہا "اچھا چرغا بھی؟"

" جی !"

" جبھی تم میں اتنی انرجی ہے "

" جناب یہ تو مجبوری کی انرجی ہے۔ اس لیے کہ آج گوشت کا ناغہ ہے "

" اچھا اچھا "

جب کھانا کھا چکے تو حفیظ صاحب نے جیب سے ٹوتھ برش نکالا۔ اس سے دانت صاف کیے۔ اس پر میں نے کہا " اچھا ٹوتھ برش بھی جیب میں رکھتے ہیں ؟"

" ہاں تاکہ منہ سے بدبو نہ آئے "

" بدبو کی شکایت تو آپ کی بیوی کو ہو سکتی ہے "

" آج کل میں اس کے بوسے نہیں لیتا "

" کیوں کیوں ؟"

" آج کل ملک میں ہنگامی حالات ہیں "

" کیا کوئی اس ضمن میں بھی آرڈیننس آگیا ہے ؟"

" آرڈیننس ؟"

" جی !"

" آرڈیننس ؟"

" جی !"

" سنو، میں آج کل ملکی کاموں میں، بُری طرح اُلجھا ہوا ہوں۔ ادبی ثقافتی محاذ

کا صدر ہوں ۔ بڑا کام کرنا پڑتا ہے ۔ کبھی ریڈیو پہ ، کبھی ٹیلی ویژن پہ ، کبھی جلسوں میں ،
کبھی جلوسوں میں ، ایک منٹ اپنا نہیں ، سب کچھ قوم کی نذر کر دیا ہے جب حفیظ صاحب
یہ باتیں کر رہے تھے تو اُن کی صورت کی وفتی مسکینی سے ایسا نظر آ رہا تھا جیسے وہ
سمجھا رہے ہوں کہ دیکھا بچو! میں نے قوم کی خاطر کتنا کچھ تج دیا ہے ۔

ہاں تو ٹوتھ برش سے یاد آیا کہ حفیظ صاحب کی زندگی اس لحاظ سے مجاہد کی
زندگی ہے کہ وہ اپنے بیگ اور جیبوں میں جُملہ سامانِ ضرورت ہمہ وقت رکھتے ہیں
مثلاً ٹوتھ برش ، ٹوتھ پیسٹ ، تھوڑا بہت راشن ، معجونیں اور بیاض ، اور اگر سفر
میں ہوں تو راشن کے ساتھ اسٹوو ، چائے ، پیالی ، چمچہ ، چھوٹی کیتلی ، لہسن ، پیاز
حتیٰ کہ ایک چھوٹی سی چھٹی تک کمر پہ لادے پھرتے ہیں ۔ جیسے ایک سپاہی ، چونکہ یہ
فوج میں رہے ہیں اس لیے معدے کے لیے اپنا "سامانِ حرب" ساتھ رکھتے ہیں ۔

ایک دن میں نے پوچھا " بندہ پرور چائے پیجئے گا ؟ "

" نہیں برخوردار " ۔

" کیوں جناب ؟ "

" چائے بنانا کسی کو نہیں آتا حتیٰ کہ میری بیوی کو بھی نہیں آتا " ۔

" پھر تو آپ بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے " ۔

لفظ عذاب کی ٹھوکر کو محسوس کر کے کہنے لگے ۔ بچو! چائے بنانا تو میری بیوی کو
بھی نہیں آتی اور نہ ہی کبھی ، میں نے کسی اور دوست کے ہاں اچھی چائے پی ہے " ۔

"آخر اس نسوانی کوتاہی کا کوئی حل ؟"

"ہے ۔"

"کیا ؟"

" ہَیں ۔"

" یعنی ؟"

" کسی دن تجھے میں چائے بنا کر پلاؤں گا ۔"

معلوم ہُوا کہ یہ نہ صرف خود چائے بنا کر پیتے ہیں بلکہ سالن تک خود پکا کر کھاتے اور کھِلاتے ہیں ۔ یعنی بیوی کے فرائض پچاس فیصد تو خود ہی ادا کر لیتے ہیں باقی جو پچاس فیصد ادا نہیں کر سکتے اس کا افسوس ہوتا ہوگا ۔ اس لیے کہ یہ مزاجاً کسی طرح بھی کسی کے ممنونِ احسان ہونا نہیں چاہتے ۔

---

۵ [۱]

جفاکشی میں بھی یہ فرد ہیں ۔ اور شاعروں کی طرح نہیں ہیں کہ ستاروں پہ کمند
ڈالتے ہوں اور خود اُٹھ کر پانی تک نہ پی سکتے ہوں ۔ ان کی زندگی پیہم جدّ و جہد اور
سراسر جدّ و جہد کی رہینِ منت ہے ۔ ایک شخص جو ناداری کی دہلیز سے اُٹھ کر سرفرازی کی منزل
تک جا پہنچا ہو وہ قابلِ قدر ہی نہیں ۔ قابلِ تعظیم بھی ہے ۔
اُنھوں نے اپنے آپ کو سنوارنے کے لیے ، اتنی تگ و دو کی کہ بالآخر یزداں

---

[۱] جب میں یہاں پہنچا تو میں نے سوچا ، کون پوری کتاب کو ایک سانس میں پڑھے گا ۔ لہٰذا دماغ نے کہا یہ رُکو بھئی رُکو ! چنانچہ میں نے بے سوچے سمجھے کتاب کو چند حصّوں میں تقسیم کر دیا ۔ یوں چند واقعات آگے پیچھے بھی نظر آئیں گے مگر میں اپنی جگہ مطمئن ہوں ۔ کیوں کہ ان لفظوں میں جو ایک ذہن موجود ہے جو ایک ہی شخصیت کے گرد گھوم رہا ہے ۔ وہ پہلی سطر سے لے کر آخری سطر تک ، ایک ہی انداز میں ، اپنی کارگزاری کو آپ کے سامنے پیش کرتا رہے گا جیسے روح کا تعلق جسم سے ہوتا ہے ۔ ویسے ہی میرے پہلے لفظ کا تعلق آخری لفظ سے ہے ۔ اس لیے بندہ تو بخنت ہو گیا ۔

کو بھی مائل بہ التفات کر لیا۔ ذرّے کو آفتاب بننے کے لیے یا قطرے کو گہر ہونے تک، جن جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اُن تمام مراحل سے یہ بھی گزرے۔ کیونکہ میری زندگی بھی، ایک چھوٹے پیمانے پر، کچھ ایسی ہی ناہمواریوں کی داستان ہے۔ اس لیے میں بھی جب ماضی کو دھیان میں لاتا ہوں تو مجھ پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ قدرت مہربان ضرور ہے۔ مگر اس کا کم سوادوں سے کوئی رشتہ نہیں۔

جفاکشی ہی کی بدولت، انھوں نے قدرت کے حُسن کو بھی جس جس طرح لُوٹا۔ وہ بھی انہی کا دل گردہ ہے اور کسی کا بوتا نہیں۔ گیارہ بار تو کشمیر گئے۔ ان گیارہ بار میں سے پانچ مرتبہ جموں سے پیدل سری نگر تک پہنچے۔ وہ بھی قدم قدم پر رُک اور ٹھہر کر۔ اگر یہ استنے بُردبار نہ ہوتے تو مناظرِ قدرت کی دولت سے استنے مالامال نہ ہوتے۔ اس ضمن میں جتنے مال دار یہ ہیں اور کوئی شاعر نہیں۔ باقی تو زیادہ تر ایسے ہیں جو دُور کے جلووں ہی کے گنہگار ہیں۔

ایک دن خبر آئی کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری کو، فوج کے چند افسران نے ناراض ہو کر تالاب میں دھکا دے دیا۔ پتہ چلا کہ ان کے شعر ناپسندیدہ ٹھہرے۔

کچھ عرصہ پہلے میں نے پوچھا "حفیظ صاحب وہ "غسلِ صحت" والا قصّہ کیا تھا؟"

"غسلِ صحت؟"

"جی ہاں! وہ جو آپ کو ایک مرتبہ تالاب میں گرا دیا گیا تھا؟"

"بھئی وہ قصّہ یہ تھا کہ میرے ایک فوجی دوست کی شادی تھی۔ انھوں نے

کہا حفیظ صاحب میری شادی پر، ایک سہرا پڑھ دیجیے گا۔ قصّہ کچھ یوں تھا کہ جن کی شادی تھی وہ زیادہ عمر کے تھے۔ جن سے شادی ہو رہی تھی وہ کم عمر تھیں۔ چونکہ میری ان سے دوستی تھی اس لیے میں نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے چند چوٹیں بھی کر دی تھیں جو ناگوار گزریں۔ یوں غرقابی کی نوبت آ گئی۔

اس قصّے کو شوکت تھانوی مرحوم نے بھی اپنے مخصوص انداز میں لکھا تھا۔ وہ بھی سُن لیجیے:

"راولپنڈی سے کچھ خبریں تیر تیر کر لاہور پہنچ رہی ہیں اور عجیب مد و جزر پیدا کر رہی ہیں۔ روایت ہے کہ شاعرِ سخن کو واقعی آب بازی کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ آپکا ایک شعر بلکہ مطلع اس وقت بے ساختہ یاد آ رہا ہے ؎

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

ڈوبے ہوئے پائے جانے کی اطلاع تو پہنچ گئی مگر قطرے کے لیے ترسنے کی اطلاع ہی نہ دی آپ نے، اپنوں سے یہ تکلّف کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ جو واقعات یہاں تک روایت بن کر سیلابی صورت میں پہنچے ہیں۔ ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی پانی سر سے گزر گیا ہے سچ کہا ہے کسی نے کہ نیکی کر دریا میں ڈال مگر اب تو آپ اس حقیقت

کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں گے کہ ؎

ڈوبنے کے واسطے کافی ہے اِک ہلکی سی موج

ہاں اُبھرنے کے لیے موجوں میں طوفاں چاہیے

سُنا ہے کہ ٹھیک ساڑھے ساحل آب آب تھے اور آپ اس اطمینان سے

تھپیڑے کھا رہے تھے گویا اس بحر میں بھی غزل کہہ سکتے ہیں "

یہ کمال شوکت تھانوی ہی کا ہے کہ اُس نے اس واقعہ کو بھی، اس انداز میں رقم کر دیا کہ لُطف آ گیا۔ حالانکہ اس میں لُطف اندوزی والا کوئی پہلو نہ تھا بلکہ

حفیظ صاحب بسلسلہ ملازمت راولپنڈی میں تھے۔ اُن دنوں نقوش کی کوئی تقریب تھی۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ راولپنڈی سے کیا آئیں گے۔ دعوت نامہ نہ بھیجا۔ دیکھا تو تقریب میں موجود، میں نے سوچا دعوت نامہ پہنچا ہی ہوگا تو آئے ہیں سے ملے تو حسبِ معمول مُسکرا کے ملے۔ ہاتھ ملایا تو ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے کہا "جناب میرا ہاتھ تو چھوڑیئے تاکہ کسی اور سے بھی ملا سکوں "

" یہ ہاتھ نہ چھوڑوں گا "

" کیوں ؟"

" تم نے مجھے اس تقریب کا دعوت نامہ کیوں نہیں بھیجا ؟"

" بھیجا نہیں تو آپ آئے کیسے ؟"

" وہ تو میں نے کہیں سے سنا تھا۔ اس لیے آ گیا ہوں "

" واقعی ؟"

میرے لفظ واقعی پر ان کے آنسو نکل آئے ۔ جتنی خوشی مجھے اس تقریب کی تھی۔
اُس سے زیادہ ندامت اس واقعہ پر ہوئی ۔

آپ بیتی نمبر کی تقریب میں حفیظ (جالندھری) صاحب نے تقریر کرتے ہوئے اور
باتوں کے ساتھ مجھے بھی جالندھر کا رہنے والا بنایا ۔ کچھ لوگ حیران ہوئے ۔ کچھ کی
معلومات میں" اضافہ" ہوا ۔

تقریب کے بعد میں نے کہا " حفیظ صاحب میرا تو جالندھر سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔"

" کہاں کے رہنے والے ہو ؟"

" لاہور کا ۔"

" لاہور کا ؟

" جی ہاں !"

" یہ کیسے ہو سکتا ہے جو اتنا محنتی ہو، جو اتنی لگن رکھتا ہو ۔ وہ جالندھر کا
رہنے والا نہ ہو ۔"

" اب تو واقعہ یہی ہے ۔"

" بھئی اسے میرا علاقائی تعصب کہہ لو یا کچھ ، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ جالندھر
سے باہر کا آدمی بھی ایسا پارکھ ہو سکتا ہے ؟ یہی وجہ تھی کہ میں نے کہا " ایک آدمی
سیالکوٹ نے پیدا کیا اور وہ اقبال ہے ۔ دو آدمی جالندھر نے پیدا کیے ۔ اُن میں ایک

یہ خاکسار ہے دُوسرا طفیل !"

میں نے کہا " میرا نام تو بڑے آدمیوں کے زمرے سے نکال ہی دیں اس لیے کہ " چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک "، یوں جانیں کہ جالندھر نے بس ایک ہی بڑے آدمی کو جنم دیا اور وہ حفیظ ہے "

" ہاں اب تو یونہی سوچنا پڑے گا "

" آج مجھے تیری کتاب " کرم " ملی ہے ۔ بڑی اچھی ہے ۔ مگر اُس میں مجھے تیرا مضمون مصطفےٰ زیدی پر پسند نہیں آیا ۔ کیونکہ تُو اسے زیادہ نہیں جانتا "

" یہ بات ٹھیک ہے ۔ جتنا جانتا تھا ۔ اُتنا بھی نہ لکھا "

" کیوں ؟"

" وجہ یہ تھی کہ اُس پہ جنس اس بُری طرح سوار تھی کہ وہ اس ضمن میں تقریباً دیوانہ تھا "

" پھر یہ بات لکھی کیوں نہیں ؟"

" اس میں ہلکے ہلکے اشارے تو ہیں لیکن میں نے تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی تھی "

" اب تو شہناز گل والے قصّے نے وہ سارے ہی حصار توڑ دیے "

" جی ہاں !"

" بہرحال وہ جوش ملیح آبادی سے بڑا شاعر تھا "

" جی ــــــ ؟"

" ٹھیک کہہ رہا ہوں "

" حفیظ صاحب، میں آپ کی یہ بات کبھی نہ مانوں گا۔ اس لیے کہ مجھے اس میں حُبِ علی نظر نہیں آتی "

" اچھا! بغضِ معاویہ تو ہے "

" جی ہاں وہ تو ہے "

" طفیل تجھے نہیں معلوم کہ بڑے لوگ بعض اوقات ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کہتے ہیں کہ اُن کا سارا امیج متزلزل ہو جاتا ہے۔ مثلاً مجھے ایک بار سر محمد مرتل اللہ نے ایک رقعہ دیا کہ یہ ڈاکٹر اقبال کو دے دینا۔ وہ لے کر میں اقبال کی خدمت میں حاضر ہُوا اس میں لکھا تھا کہ سپرو (سر تیج بہادر) ہندوؤں کو ملا۔ اقبال مسلمانوں کو! — یہ پڑھنے کے بعد جھٹ اقبال نے سپرو کو خط لکھا اور اس میں سر مرتل کا فقرہ نقل کرتے ہوئے بتایا "اصل میں میں بھی سپرو ہی ہوں "

" اب بتاؤ اقبال کو یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی ؟ "

" کیا جانوں ! "

" بات یہ ہے کہ دُور کے ڈھول سہانے "

" کیا آپ جوش صاحب کے ساتھ، اقبال سے بھی ناراض ہو گئے ؟ "

" نہیں نہیں، میں تو اقبال کا عاشق ہوں۔ مگر یہ بات پھر کبھی ہو گی "

یہ حفیظ صاحب ہی ہیں جن کے حصے میں، پاکستان کا ترانہ لکھنے کی بھی سعادت

آئی حکومت پاکستان نے ۱۹۵۴ء میں اعلان کیا کہ دُھن تیار ہے۔ اس پر ایک ترانہ فٹ کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا۔ جو ترانہ منظور ہوگا اس کے خالق کو دس ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ اب کیا تھا، شاعروں کے قلم چلنے لگے۔ بساط بھر سبھی نے کوشش کی۔ جو صاحب اثر تھے انھوں نے اپنا اپنا اثر بھی چلایا۔ مگر ترانہ کمیٹی نے حفیظ صاحب کے ترانے کو پسند کیا۔

اِدھر یہ اعلان ہُوا، اُدھر اخبارات میں شور اُٹھا، حفیظ صاحب کا ترانہ کسی کام کا نہیں، اس میں ایک لفظ بھی اُردو کا نہیں۔ اس سے تو فلاں فلاں شاعر کا ترانہ اچھا ہے۔ پھر وہ ترانے اخبارات میں بھی چھاپے گئے۔ مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی کیونکہ ادھر بھی کوئی معمولی شاعر نہ تھا۔ انگریز کے زمانہ کا خان بہادر تھا اور ملک ملّت کے نزدیک فردوسیِ اسلام!

ایک بار اس مسئلے پر حفیظ صاحب سے بات ہوئی تھی۔ اُنھوں نے کہا "مختصراً یہ ہے کہ اس شور وغوغا میں نمایاں آوازیں میرے ہی دوستوں کی تھیں۔ دل برداشتہ ہو کر انہی دنوں میں نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر ہے

دیکھا جو کھا کے تیر کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے

عرضِ ہُنر وجہ شکایات ہوگئی
چھوٹا سا مُنہ تھا مجھ سے بڑی بات ہوگئی

پھر آخر میں حفیظ صاحب نے بڑے دُکھ سے کہا کہ ترانہ لکھنے کی پاداش میں مجھے گالیاں تک دی گئیں۔ ایک دن میری بیٹیوں نے کہا "اباجان! ترانہ تو آپ نے لکھا ہے۔ لیکن گالیاں ہمیں دی جارہی ہیں"

عرصے کی بات ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے کی کہ منٹو پارک میں، ایک بہت بڑی نمائش ہوئی تھی۔ یاروں نے اُس میں ایک مشاعرہ بھی کر ڈالا۔ منتظمین ان کے پاس بھی پہنچے کہ شرکت فرمائیے۔ انھوں نے کہا "میرا اصول ہے کہ میں نمائشی مشاعروں میں نہیں جاتا۔ کیونکہ وہاں ادبی ذوق رکھنے والے کم ہوتے ہیں۔ نمائشیں زیادہ ہوتے ہیں"

منتظمین نے کہا "اس میں بڑے بڑے شعرا شرکت کر رہے ہیں۔ لہذا ـــــ"

"میری بلا سے"

"اُس مشاعرے کی صدارت سر عبدالقادر کر رہے ہیں"

"مجھے کیا!"

اوروں کو تو ہم پانچ سو روپوں سے زیادہ نہیں دے رہے۔ لیکن آپ کو آٹھ سو روپے دیں گے"

"جناب آٹھ ہزار پر بھی نہ جاؤں گا"

چنانچہ وہ مشاعرہ میری شرکت کے بغیر ہوا اور اُس میں خُوب اُدھم مچا۔ ہندو مسلمان اور سکھ سب شریک تھے۔ لہذا کوئی ایسا شاعر نہ جما، جو اسلام کی بات کرنے والا

تھا جوشؔ ملیح آبادی خوب چمکے۔ اس لیے کہ وہ مذہب کا تمسخر اُڑاتے تھے شراب کباب کا ذکر کرتے تھے۔

اُس مشاعرے کے دوسرے دن، میرے پاس ڈاکٹر اقبال نے علی بخش کو بھیجا کہ حفیظ کو بلا لاؤ۔ حاضر ہوا تو فرمایا کہ "کل کے مشاعرے میں کیوں نہ گئے ؟"

"یہ بات آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ جب کہ آپ خود مشاعروں کے خلاف ہیں۔"

"میری مخالفت کے باوجود تم جاتے تو ہو"

"جی ہاں!"

"پھر اس میں کیوں نہ گئے ؟"

"بس ایک اُصول کے تحت نہیں گیا۔ میں نمائشی مشاعروں میں نہیں جاتا۔"

"بُرا ہُوا"

"کیسے ؟"

"وہاں بڑی خرافات پڑھی گئیں۔ مذہب پر حملے ہوئے۔ اگر جوشؔ کا کوئی توڑ تھا تو وہ حفیظ تھا"

اس بیان کے بعد، حفیظ صاحب کی آواز روہانسی ہوگئی گلوگیر ہوگئے۔ کہنے لگے "یہ میرے لیے اِتنا بڑا تمغہ تھا جو میں آج بھی اپنے سینے پر آویزاں سمجھتا ہوں"

شاعر سہرے کہتے ہیں قصیدے پڑھتے ہیں۔ اُنھوں نے بھی یہ کام کیے۔

حسب توفیق یہ کچھ سبھی کو کرنا پڑتا ہے۔ مگر اُنھوں نے ایک بار کمال کیا تھا۔ پی۔آئی۔اے پر بھی نظم فرمادی۔ پھر اُنھوں نے اپنے جہازوں کی پرواز کو رسول اللہ کے واقعۂ معراج سے بھی تشبیہہ دے ڈالی۔ وہ بات مجھے بہت کھلی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواز ہو مگر مجھے مولانا صلاح الدین احمد کا فقرہ نہیں بھولتا۔ "آج حفیظ صاحب نے ہوائی جہازوں پر نظم لکھی ہے۔ کل کو باٹا کے جوتوں پر نظم لکھیں گے۔" پھر انھوں نے یہ بھی فرمایا۔ "بڈھا پاگل ہو گیا ہے۔" میں اس بات کو نہیں مانتا۔ یہ کبھی پاگل نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ آپ کو پاگل نہ بنا دیں۔ وہ جوہر نہیں۔ یہ جوہر ہے۔ ہاں زیادہ سے زیادہ خبطی کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ بات بھی وہی کہہ سکتا ہے جو کم از کم میرے پائے کا خبطی ہو۔ یہ خبطی پن نہیں تو اور کیا ہے کہ جالندھر سے ایک بے یارومددگار انسان اُٹھا اور اُس نے اپنے شعری ریاض سے، اَن تھک ریاض سے دنیائے اَدب سے اپنا لوہا منوالیا۔ بہ منّت نہیں۔ بہ زور!

یوں تو ان کے مناقشاتی معرکے، کئی شاعروں سے ہوئے۔ خوب خوب ٹھنی۔ مگر ان میں ایک معرکہ، تاجور نجیب آبادی کے ساتھ، خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

تاجور نجیب آبادی سے ان کی کبھی نہ بنی۔ صرف ٹھنی ہی ٹھنی۔ تاجور انھیں شاعر ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگر تیار تھے بھی تو ان کی شاعرانہ چودھراہٹ انھیں کھلتی تھی چنانچہ رہی تو صرف تنا تنی ہی رہی۔ ادھر یہ تاجور کو شاعر کم، پہلوان زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ انھیں شاعر کم، گویا زیادہ کہتے تھے۔ اِدھر اُدھر کے مشاعروں میں بھی چشمکیں ہوا کرتی

تھیں مگر ایس۔ پی۔ ایس کے ہال والی پینٹنگ تو حیران کُن بلکہ دل خوش کُن زیادہ تھی۔

جب حفیظ صاحب پڑھ کر اسٹیج سے اُترے تو پروگرام کے مطابق ناجو پارٹی نے نازش رضوی کا نام پکارا، اوّل تو اتنے بڑے شاعر کے بعد، ان سے کم تر درجے کے شاعر کو بلانا، یوں بھی ان کی توہین تھی۔ صرف اسی پہ اکتفا نہ کیا گیا۔ دیکھا کہ اس کم بخت کے اسٹیج پر آنے کے ساتھ ساتھ دو تین آدمی طبلے اور سارنگیاں لے کر بڑھے اور خود نازش ہارمونیم لے کر پہنچے۔ اس سین کا دیکھنا تھا کہ لوگوں کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہو گیا۔ قہقہے تھے کہ چھت پھاڑے دے رہے تھے۔ یہ دراصل اس امر کا اظہار تھا کہ جناب حفیظ اگر آپ گا کر مشاعرے پڑھا سکتے ہیں تو ہم بھی گا بجا کر مشاعرہ لُوٹیں گے۔

یہ لطیفہ تو اپنی جگہ رہا۔ ویسے یہ ہے کہ حفیظ کے سامنے چراغ کم ہی شاعروں کے جلا کرتے تھے۔ یہ جہاں تہاں چھائے ہی رہتے۔ شاعری میں بھی جان تھی۔ آواز میں بھی لپک تھی۔

کہیے تو اور بھی کچھ باتیں سناؤں؟

پنجاب میں، اگر حفیظ کا کوئی مدِمقابل تھا تو وہ صرف اختر شیرانی تھا۔ اختر کی رومانی نظموں کی وہ دھوم تھی کہ باید و شاید، وہ بلاشبہ نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ گلی گلی محلّے محلّے اس کے شعر گنگنائے جاتے تھے۔ مگر وہ صرف اخبارات و رسائل کی حد تک ہی پُوجا جاتا تھا۔ کیونکہ بے تحاشا شراب پیتا تھا۔ مدہوش رہتا تھا۔ اسٹیج پر کھڑے ہو کر دو شعر بھی ڈھنگ سے نہیں پڑھ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حفیظ اُسے

بھی بات دے دیتا تھا۔

اختر شیرانی کی بات ہو رہی ہے تو ایک واقعہ اور عرض کر دوں۔ جنگ یورپ کے زمانے میں، لکھنؤ ریڈیو سے، جنگ ہی کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہُوا۔ ہندوستان کے تمام چوٹی کے شاعر جمع تھے۔ خوب خوب شعر، تلوار کی کاٹ بن کر نکلے۔ انہی شعرا میں اختر شیرانی بھی تھے۔ چونکہ یہ اُس وقت مدہوش تھے۔ اس لیے ریڈیو والوں نے مناسب سمجھا کہ اُن کی نظم ساغر نظامی سے پڑھوا دیں۔ چنانچہ اختر کی نظم جب ساغر نے اپنی لے میں پڑھی (اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا) تو ایک سماں بندھ گیا۔ پھر تو سبھی کے چراغ گُل ہو گئے۔ حتیٰ کہ حفیظ صاحب کا بھی چراغ گُل ہو گیا۔ بہر حال یہاں تو صرف عرض کرنا ہے کہ کم از کم مشاعروں کی حد تک تو اختر بھی، حفیظ کے سامنے نہیں ٹکتے تھے۔ یعنی شاعر جذبات بھی، اس خانہ خراب کے سامنے نہیں ٹکتا تھا۔

ویسے تو یہ جناب، شاعر تھے۔ مگر انھیں افسانہ نویسی کی بھی سُوجھی۔ ایک کتاب افسانوں (ہفت پیکر) کی لکھ ڈالی۔ ایک بار مجھ سے کہا:

قصّہ یہ تھا کہ جب میں "ہزار داستان" کا مدیر ہُوا تو لوگوں نے کہا۔ یہ تو شاعر ہے۔ اس لیے کسی افسانوی رسالے کا مدیر کیونکر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میری راجپوتی غیرت نے کہا۔ اب لکھو افسانے، ورنہ چھوڑو ایڈیٹری، چنانچہ لکھے افسانے، اور وہ پسند کیے گئے۔ میرے نزدیک ایک شعر نہ کہا۔ ایک افسانہ لکھ لیا۔ تمھیں معلوم ہے کہ بعض اوقات

ایک شعر میں پوری کہانی ہی نہیں ہوتی۔ صدیوں کی تاریخ بھی جھلملاتی نظر آتی ہے۔

کبھی کبھی مجھے بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ میں بھی ایک رسالے کا مدیر ہوں اور یہ احساس جب وجود پہ چھا جاتا ہے تو دل جھومنے لگتا ہے۔ فراواں احساسِ ذات بھی، کیا دولت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ تصویر کا ایک ہی رُخ سامنے ہو، جو دھراہٹ کا، دوسرا رُخ سامنے نہ ہو، یعنی مآل کا، پھر میں تو ایک رسالے کا مدیر تھا اور مُنول انھوں نے تو کئی میدان مارے۔ کئی اچھے رسالوں کے مدیر رہے۔ ان کی خوشی کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ یہ جانیں!

جب یہ جالندھر میں تھے تو انھوں نے 'اعجاز' نکالا۔ پانچ شمارے نکلے کہ بند ہو گیا پھر انھوں نے سوچا کہ اداروں پہ چھاپا مارنا چاہیے لیکن رسالوں کا مالک نہیں بننا چاہیے۔ اس لیے کہ مالک بننے میں مالی مار پڑتی ہے اور صرف ایڈیٹری میں شان بڑھتی ہے۔ چنانچہ یہ اسی حکمتِ عملی کے تحت شباب اُردو کے جائنٹ ایڈیٹر رہے۔ ہزار داستان، پھول، تہذیب نسواں اور مخزن کے مدیر رہے۔ یعنی دشتِ ادب میں خوب گھومے پھرے ہیں۔ ایسی "قلم نوردی" کو میں دشتِ ادب میں چہل قدمی ہی کہوں گا۔ گلشنِ ادب میں "قدم رنجگی" نہ کہوں گا۔

حفیظ صاحب نے دیگر رسائل کی اداروں کا حال تو بتایا مگر یہ نہ بتایا کہ انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار کی بھی ایڈیٹری کی تھی۔ اور وہ اخبار حمایتِ اسلام تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں، ان سے استفسار کرنا بھی نہیں چاہیے۔

کیونکہ میری معلومات یہ ہیں کہ یہ سرداری انھیں راس نہیں آئی تھی۔ ہفت روزہ اخبار کا کام بہت زیادہ ہوتا ہے اور یہ شاعر، ایک ایک مصرع سوچ کر کہنے والے، وہ بھی موڈ ہوا تو شعر کہنے والے، چنانچہ ڈھیر ساری نثر ہی نثر کے چکر نے انھیں بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔ دوست بھی ان کی مدد کو پہنچے تھے۔ اس کے باوجود اخبار کو سنبھال نہ سکے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان سے یہ کہہ دیا جاتا کہ آپ صرف شعروں ہی شعروں میں سارے پرچے کو ایڈٹ کیا کریں گے تو انھیں اتنی زیادہ پریشانی نہ ہوتی کہ وہاں سے سال کے اندر بھاگ نکلتے۔

آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ایک ایسا مرد میدان، جو کئی رسالوں کا مدیر رہا ہو۔ وہ ایک ہفت روزہ اخبار کا مدیر بن کر، کیوں نہ اپنی اہمیت کو منوا سکا۔ اس ضمن میں میرا جواب صرف اتنا ہی ہے کہ یہ معاملہ سہج سہج کا نہ تھا چونکہ ایک مصرع کہنے کے بعد، دوسرا مصرع کہنے کے لیے تھوڑا سا وقت درکار ہوتا ہے اس لیے اس آپا دھاپی میں "شعر موزوں" ہی نہ ہو سکے۔

اودھ پنچ ایک ایسا اخبار تھا۔ جسے پگڑیاں اُچھالنے میں مزا آتا تھا۔ اس نے مولانا حالی کے خلاف محاذ بنایا۔ تو وہ مولانا حالی کو مولانا خالی لکھنے لگا۔ انھی دنوں ان کی بھی ایک نظم چھپی تھی۔ جس کا نام تھا "فرصت کی تلاش"، جو کچھ اس قسم کی تھی کہ

یوں وقت گزرتا ہے فرصت کی تمنا میں
جس طرح کوئی پتا بہتا ہوا دریا میں

اس نظم کا چھپنا تھا کہ اُس نے ان کی بھی خبر لے ڈالی، خوب بُرا بھلا کہا۔ تان یہاں پہ توڑی۔ عجیب بے تُکا شاعر ہے۔

منشی سجاد حسین مجھ سے دُور جا چکے ہیں۔ مگر اُن سے ملاقات ہوگی۔ تب پوچھوں گا۔ حضرت! یہ کیا زیادتی؟

○

حفیظ صاحب اکثر علامہ اقبال کا ذکر کرتے ہیں ۔ ایک بار اُنھوں نے مجھے بتایا کہ ایک دن میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے میری ایک نظم پڑھ کے مجھ سے کہا "حفیظ تو جی ۔ نی ۔ ایس (GENIUS) ہے"۔

حفیظ صاحب کہتے ہیں کہ میں انگریزی پڑھا ہُوا نہ تھا ۔ میں نے سمجھا کہ مجھے شاید علاّمہ نے پاگل کہا ہے ۔ سُنا اور چُپ ہو گیا ۔

کچھ دنوں کے بعد، ڈاکٹر تاثیر نے بھی مجھے اسی لفظ سے یاد کیا تو میں نے اُس سے پوچھا ۔ یار تُو مجھے اس لفظ کے معنی تو بتا ۔ جب اُنھوں نے معنی بتائے تو پھر میں نے تاثیر کو بتایا کہ ابھی کوئی پندرہ بیس روز ہوئے کہ علامہ نے بھی مجھے اسی لفظ سے یاد کیا تھا ۔

حفیظ صاحب نے بتایا کہ علامہ اقبال مجھ سے شاہنامہ اسلام سُنا کرتے تھے اور رویا

کرتے تھے۔ یہ بات سُن کر میں ہنسنے لگ گیا۔

کہنے لگے "ہنس کیوں رہے ہو؟"

ایک لطیفہ یاد آگیا ہے جو مشہور ہے۔

"وہ کیا؟"

میں نے سُنا ہے کہ آپ ایک دفعہ حکیم فقیر محمد چشتی کے پاس تشریف لے گئے تھے۔ اُن سے آپنے اپنی علالت کا حال بیان کیا۔ اُنھوں نے نسخہ تجویز کر دیا۔ آپ نے پوچھا "کوئی پرہیز؟"

انھوں نے کہا "کوئی دماغی کام نہ کریں"

آپنے فرمایا "آج کل شاہنامہ اسلام لکھ رہا ہوں"

اس پر حکیم صاحب نے فرمایا تھا "وہ لکھتے رہیں"

آج جو آپنے یہ فرمایا کہ علامہ اقبال آپ سے شاہنامہ اسلام سُن کر رو یا کرتے تھے تو مجھے حکیم فقیر محمد چشتی والا لطیفہ یاد آگیا۔

علامہ اقبال ہی کے ذکر میں اُنھوں نے ایک بار کہا "علامہ مجھ سے بدگمان بھی رہے۔ حالانکہ میری عقیدت میں کبھی بھی سرمو فرق نہیں آیا۔ ایک بار کرم چند کے اخبار "پارس" میں "جرّاح" کے قلمی نام سے، علامہ کے خلاف ایک مضمون چھپا۔ مضمون کا چھپنا تھا کہ علامہ کے مدّاحوں کو تاؤ آگیا۔ لال دین قیصر نے ایک دن مجھے سربازار گریبان سے پکڑ لیا۔

میں نے وجہ پوچھی تو بپھرے ہوئے انداز میں کہا " باز آجاؤ۔ ورنہ جان سے مار ڈالوں گا "

" کس بات سے باز آجاؤں ؟"

" علامہ کے خلاف لکھنے سے !"

" اگر آپ کا اشارہ "پارس" والے مضمون کی طرف ہے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ میرا لکھا ہوا نہیں ہے "

" پھر کس کا لکھا ہوا ہے ؟"

" میرا تو خیال ہے کہ وہ مضمون جوش ملسیانی کا لکھا ہوا ہے "

پھر انھوں نے ایک بار یہ بھی انکشاف کیا کہ " میں جب تک مخزن کا ایڈیٹر رہا۔ میں نے ڈاکٹر اقبال کی کوئی چیز نہیں چھاپی ۔

" کیوں ؟"

" ایک بات تھی "

" مجھے بھی بتا دیجیے "

" بتانا نہیں چاہتا "

" مخزن کے ابتدائی دور میں، جب کہ اس کے مدیر سر عبدالقادر تھے علامہ کی چیزیں اس میں چھپا ہی کرتی تھیں ۔ اس اعتبار سے تو اُس رسالے سے ڈاکٹر صاحب کے جذباتی قسم کے تعلقات بھی تھے "

"یہ صحیح ہے"۔

"لیکن ___؟"

"لیکن کیا؟"

بھئی قصہ یہ تھا کہ جب میں اس کا مدیر بنا تو میں مارے عقیدت کے سب سے پہلے علامہ ہی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ان سے گزارش کی کہ اپنے ہاتھ سے چند اشعار لکھ دیجیے تاکہ میری حوصلہ افزائی ہو۔ علامہ نے پس و پیش کیا۔ میں نے اصرار کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھوں نے کچھ عنایت فرمانے سے صاف انکار کر دیا۔ میں چونکہ ان کی ذات سے بے اندازہ عقیدت رکھتا تھا۔ اس لیے مجھے سخت صدمہ ہوا۔ مارے غصے کے میری زبان سے نکل گیا "آج کے بعد میں آپ سے مخزن کے لیے کچھ نہ مانگوں گا"۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں جب ہمارے ہاں بھی الیکشن زوروں پر تھے۔ اُن دنوں یہ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ میں نے محض تفننِ طبع کے لیے کہا "حفیظ صاحب آجکل جب کہ بہت سے لوگ الیکشن لڑ رہے ہیں۔ آپ کیوں کھڑے نہ ہوئے؟" کہنے لگے "خدا کسی دشمن کو بھی کھڑا نہ کرے"۔

"کیوں؟"

"سنو، یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ علامہ اقبال کسی کو شعر نہیں سنایا کرتے تھے۔ بڑے بڑوں کو صاف انکار کر دیا کرتے تھے۔ شاید اسی بات کا وہ انتقام تھا۔ جو

قدرت نے اُن سے ایک عجیب شکل میں لیا تھا "
" میں سمجھا نہیں "
" وہ یہ کہ انھیں ایکشن کے لیے کھڑا کر دیا - ان کے مقابلے میں ایک شخص دین محمد کھڑا ہوا - اُس کے حواریوں نے ان کی "جد پشت پُن" ڈالی - ایسی ایسی باتیں اُدھر سے اُچھلیں جنھیں ہم جیسے عقیدت مند سنتے تھے - شرماتے تھے مقابلہ زبردست تھا - ووٹروں کو رام کرنے کے لیے جب یہ نکلتے تھے تو راستے میں فرمائشیں ہوتی تھیں کہ شعر سنائیے ، شعر سنائیے - ایک جگہ نہیں ، دسوں جگہ ، چنانچہ انھوں نے ہر ہر جگہ شعر سنائے کسی فرمائش کو رد نہ کیا - وہ شخص جو کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا وہ بھی اس ایکشن کی وجہ سے اِتنا سستا ہو گیا تھا "

ایک دن یہ بھی معلوم ہُوا کہ ان پہ ٹیگور اور اقبال کا بہت اثر ہے - چنانچہ اُنھوں نے بتایا " میں ایک کے خیالات پہ مرتا تھا اور ایک کے پیغام پر مرتا تھا - اور میں تھا کہ ان دو وزنی پاٹوں میں بُری طرح پس رہا تھا - کبھی اُدھر لڑھکتا تھا - کبھی اِدھر لڑھکتا - نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا قصہ تھا - میں نے ٹیگور سے متاثر ہو کر کہا تھا ؎

آہ ندی تھی نہ میدانِ گل و لالہ تھا یہ
نغمۂ ٹیگور تھا یہ سحرِ بنگالہ تھا یہ

پھر اقبال نے آگے بڑھ کر راستہ روک لیا - میں نے ان کی خدمت میں

بھی خراجِ تحسین ادا کیا ۔

اب یہ طوفانِ حبابات افزا تھا میرے سامنے
نغمۂ اقبال کا دریا تھا میرے سامنے

مگر

ہر نغمہ، نغمۂ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ ہم آواز تھا

فراق گورکھپوری نے میرے بارے میں ایک مضمون رسالہ نگار میں لکھا تھا اس نے سچ کہا تھا کہ یہ ٹیگور اور اقبال میں گم ہو کے رہ گیا تھا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو بڑے جتنوں سے سہی کسی نہ کسی طرح سے اپنے آپ کو اس چکر میں سے نکال ہی لیا۔ لوگ جو کچھ بھی کہیں، ان کا تو تاثر یہ ہے ؎

مدعائے زیست حاصل ہوتے ہوتے رہ گیا
جزو اپنے کُل سے واصل ہوتے ہوتے رہ گیا

میں نے ایک دن حفیظ صاحب سے سوال کیا کہ " علامہ کی شاعری ہمیں اسلام اور اس کی سربلندی کا درس دیتی ہے ۔ لیکن علامہ نے خود کئی دینی فرائض کی بجا آوری نہ کی ۔ مثلاً حج نہ کیا ۔

اقبال نے حج نہیں کیا تو اچھا ہی کیا ۔ مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی ہے مگر میں وہاں سے آزردہ آیا ۔ مکہ میں عیاشی بہت ہے ۔ اہل دول شیوخ کے پاس

چار چار بیویوں کے علاوہ کئی کئی لونڈیاں بھی ہیں۔ شراب بھی عام، شاید یہی دو کام، اُن شیوخ کے رہ گئے ہیں! استغفراللہ!

کھُل کر بات کروں گا تو مسلمان مجھے مار ڈالیں گے۔ مگر یہ امر اپنی جگہ صحیح ضرور ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مدینہ میں خیر غالب ہے۔ وہاں اللہ کے نیک بندوں کی تعداد خاصی ہے۔

میں نے بات کا رُخ موڑا "حفیظ صاحب! ہندوؤں کی بھی تو تیرتھوں پہ گئے؟"

"ہاں بھئی کورو کشیتر بھی گیا ہوں۔ متھرا بھی گیا ہوں۔ وہاں بھی جاکر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ وہاں برائیوں کی جڑ مہنت مہاراج ہیں۔ عورتیں خود ان کے پاس جاتی ہیں۔ بیٹا بیٹی لینے کی خاطر، پھر ایسے فعل کو بُرا نہیں سمجھتیں۔ بلکہ مہاپُن سمجھتی ہیں۔

بات کا رُخ غلط راہوں پہ چل نکلا تھا۔ یہ دُنیا بس تیزی سے جنسی اختلاط کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے کوئی کیا کیا اور کہاں تک قصّے بیان کرے۔ اس لیے میں نے بھی عافیت اسی میں دیکھی کہ واپس اپنے موضوع پہ آؤں!

میں نے حفیظ صاحب کو چھیڑا "ہمعصر ایک دوسرے کی تعریف نہیں کرتے۔ ذرّہ بھی آفتاب کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کیا آپ نے کبھی اقبال کو سراہا؟"

"اقبال کی زندگی میں، اقبال کو سراہنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ کیونکہ اُنھوں نے اپنی زندگی ہی میں فضیلتوں کا تاج پہن رکھا تھا۔ ویسے میں نے اقبال کی زندگی میں بھی، یونیورسٹی ہال میں، جو اقبال ڈے منایا گیا تھا۔ اس کے لیے خاصے اہتمام کے

ساتھ نظم کہی تھی۔ جو پسند کی گئی تھی۔ اتنی پسند جسے مشاعرے کی اصطلاح میں "چھت اُڑنا" کہتے ہیں۔

جب اقبال کا انتقال ہُوا تو میں لندن میں تھا۔ اس خبر پر اتنا رویا تھا۔ اتنا رویا تھا کہ ہچکی بندھ گئی تھی۔ بچّوں کی طرح بلک بلک کر رویا تھا۔ پھر جب وہیں لندن میں اقبال ہی کے سلسلے میں جلسہ ہُوا تو اس موقع پر بھی، میں نے نظم لکھی تھی جس کے دو چار شعر یہ ہیں:-

غم حوصلہ مند ہو گیا ہے	دل صبر پسند ہو گیا ہے
اب چشمہ ہی بند ہو گیا ہے	دریا دریا تھے میرے آنسو
اب اور بلند ہو گیا ہے	اقبال بلند تھا ہمارا

غرض نظم پڑھتا جاتا تھا۔ روتا جاتا تھا۔ سامعین بھی سنتے جاتے تھے۔ روتے جاتے تھے۔ بالکل وہی سماں تھا جیسے سامعین کے سامنے، کسی ذاکر نے واقعاتِ کربلا کا ذکر چھیڑ دیا ہو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میں (یعنی کہ محمد طفیل) شاعروں کے خلاف ہوں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میری حیثیت زیادہ مخدوش نہیں۔ کیونکہ میں شاعری کے خلاف نہیں ہوں۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعری کی بنیاد پر، شاعر سے بھی محبت کرنی پڑتی ہے۔ یہی حال حفیظ صاحب کے بارے میں میرا ہے۔ یعنی مجھے ان کی شاعری کی وجہ سے ان سے محبت کرنی پڑی۔ اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں کہ کوئی ایسا شاعر بھی ہے جس کے

ذاتی اوصاف کی وجہ سے اس کی شاعری بھی اچھی لگی ہو تو میں فوراً جگر مراد آبادی کا نام لوں گا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے حفیظ صاحب کی شعری صلاحیتیں پیاری لگتی ہیں میں نے ان کے کلام سے ایسی نظم چُنی ہے جس میں خود حفیظ صاحب بھی براجمان ہیں۔ ان کے جذبات و احساسات بھی موجود ہیں۔ پھر ان کی شاعری میں جو، ان کا طرزِ دلنشیں ہے وہ بھی موجود ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اس ساری ہی نظم کو یہاں نقل کر دوں۔ یوں ایک تیر سے کئی نشانے ہوں گے۔

نظم کا عنوان ہے "میرا کلامِ بہتریں"۔

آج کل میرے کلامِ بہتریں کی ہے تلاش
آپ بیتی آپ کو اپنی سُنا سکتا ہیں کاش
اِک طرف فکرِ سخن تھی اِک طرف فکرِ معاش
اِس تصادم سے ہوا تھا شیشۂ دل پاش پاش

عرش پہ گونجی تھی اُس دم ایک آوازِ حزیں
تھی یہ آوازِ حزیں
میرا کلامِ بہتریں

مدتوں جنسِ سخن کے بیچنے پر تھا مدار
میری مزدوری چکاتے تھے مرے سرمایہ دار
کوڑیوں میں رولتے تھے جب وہ موتی بار بار
دید کے قابل ہوا کرتے تھے میرے شاہکار

خندہ آتا تھا مرے لب پر، مگر اندوہگیں
خندۂ اندوہگیں
میرا کلام بہتریں

شعر کا دامن گردوں سے نپٹتے تھے بے شعور
پھر سیاہی بن کے ڈھلتا تھا مری آنکھوں کا نور
بعد ازاں ہوتی تھی میری حاضری اُن کے حضور
سرد مہری دیکھتی تھی گومئی چشم غیور
پانی پانی ہو کے بہہ جاتی تھی آہِ واپسیں
میری آہِ آتشیں
میرا کلام بہتریں

میرے دم سے جن دنوں روشن تھی ہر بزمِ سخن
شمع کہہ کہہ کر جلاتی تھی مجھے ہر انجمن
میری بولی بولتے تھے ہم صفیرانِ چمن
پھر سرِ بازار کرتے تھے نمودِ ما و من
تھا مرے نخلِ ہنر سے خرمنِ ہر خوشہ چیں
خرمنِ ہر خوشہ چیں
میرا کلام بہتریں

اس نرالی گرمِ بازاری سے مَیں تنگ آگیا
عارضِ عرضِ سخن پہ اِک نیا رنگ آگیا
میرے ہاتھ اِک اور ساز اِک اور آہنگ آگیا
کچھ نہ کہنے سننے رہنے کا مجھے ڈھنگ آگیا

اب اُڑائی جا نہیں سکتی یہ طرزِ دلنشیں
ہے یہ طرزِ دلنشیں.
میرا کلام بہتریں

خامشی میرے سخن کا اِک نیا انداز ہے
اس نئے انداز پر عرضِ سخن کو ناز ہے
ہاں یہی نیرنگ ہے جو سر بسر اعجاز ہے
ہاں یہی آہنگ ہے جو بے نیازِ ساز ہے

صورتِ بے حرف ہے اور معنئ وجد آفریں
معنئ وجد آفریں
میرا کلام بہتریں

اب چراغ اپنا تہِ دامن جلا لیتا ہوں میں
جب بھی تنہائی ملے محفل سجا لیتا ہوں مَیں
نغمۂ دل، دل ہی دل میں گنگنا لیتا ہوں میں
دل ہی دل میں رقص کر لیتا ہوں گا لیتا ہوں میں

یہ کلام بہتریں اب لب تک آتا ہی نہیں
لب تک آتا ہی نہیں
میرا کلامِ بہتریں

ہر ستارہ اکیلت میں ہے آپ اپنی مثال
ہر گلِ رنگیں بجائے خود ہے دنیائے کمال
اے کہ تیرے لب پہ ہے "قدرِ فادی" کا سوال
دیکھ میرے آنسوؤں کا رنگ داغوں کا جمال

ہے کلامِ بہتریں میرا نمایاں ہر کہیں
ہے نمایاں ہر کہیں
میرا کلامِ بہتریں

حفیظ صاحب کی نظم آپ نے پڑھ لی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس میں کچھ نہ کچھ ملا ہی ہوگا۔ کوالٹی بھی، احوال بھی، فن بھی، اعتماد بھی، اور کچھ نہیں تو ایک نیا انداز تو ضرور ملا ہوگا۔ اُردو نظم کو جتنی سندیں، جتنی انوکھی بحریں، جتنا "منزلیت" بیان اور جتنا نیا انداز حفیظ صاحب نے بخشا ہے۔ کم ہی کسی شاعر کو نصیب ہوا ہوگا۔ اگر کوئی ان حقائق کو تسلیم نہیں کرتا تو وہ کوئی ہٹ دھرم ہوگا معقول آدمی نہ ہوگا۔

ہر حکومت نے انھیں نوازا۔ انگریز نے خان بہادر کا خطاب دیا۔ پاکستان کی فوجی حکومتوں نے ہلالِ امتیاز، اور پرائڈ آف پرفارمینس کے خطابات سے نوازا۔ قوم وملت

نے ملک الشعرا حسّان الملک، فردوسیِ اسلام اور شاعرِ پاکستان تک کے القابات سے نوازا۔ مگر انھیں جس اعزاز پر سب سے زیادہ خوشی ہوئی وہ ہے ہائی کورٹ کی ایک تقریب، جس میں انھیں چاندی کا قلمدان پیش کیا گیا تھا۔ اس تقریب کے بارے میں انھوں نے خود بھی لکھا تھا:-

" عالی جاہو! پاکستان میں مظلوموں کی پناہو! میں عاجز آج دارالعدل میں حاضر ہوں۔ جو ہدیہ آج مجھے اس بارگاہ سے عطا ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی اعزاز مجھ ناچیز کے لیے ممکن نہیں "۔

اس موقع پر انھوں نے جو نظم پڑھی تھی۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

یہ اہلِ فن کا رونقِ ادب و فن ہیں مصنف کہ جن کی نگارش ہے جنتِ "مدن" کی
عدالت یہ ہے آخر ملا حرفِ آخر کہ ان صورتوں میں ہے سیرت زمن کی
عدالت میں سچ بولتا ہوں وگرنہ کہاں تاب تھی مجھ کو عرضِ سخن کی

مجھے اس نظم میں جو جذبہ پیارا کے قابل نظر آیا۔ وہ یہ ہے کہ انھوں نے اس اعزاز کو اپنی ذات پر منطبق کرنے کی بجائے تمام اہلِ قلم کی طرف منتقل کر دیا۔ مثلاً:

زہے فیصلہ گاہ عدلِ وطن کی صبا صبح انوار ہے انجمن کی
قلمداں عطیہ نہیں، فیصلہ ہے ہوئی مستند قدر اہلِ سخن کی

جس طرح حفیظ صاحب کے نام کے ساتھ، شاہنامۂ اسلام کا تصوّر اُبھرتا ہے۔ اسی طرح شعر و شاعری کے ساتھ شاعر ہے ـــ اور ـــ شاعروں میں حفیظ صاحب

ایک جزو لاینفک! ــــ مشاعرے شاعر کے لیے اچھا خاصا اکھاڑہ ہوتے ہیں جہاں زور آزمائی کم، علامہ آزمائی زیادہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر متحدہ ہندوستان میں، اگر کوئی دلّی یا لکھنؤ کا شاعر پنجاب میں آکر، مشاعرہ لُوٹ لے جاتا تھا تو یہاں کے شاعروں میں صفِ ماتم بچھ جایا کرتی تھی۔ اسی طرح پنجاب کا کوئی شاعر، دلّی یا لکھنؤ جاکر ایسی واردات کر گزرتا تھا تو وہاں کے لوگوں کی ناک کٹ جایا کرتی تھی۔ چنانچہ بانیانِ مشاعرہ بھی یہ سوچا کرتے تھے کہ کسے بُلایا جائے اور کسے نہ بلایا جائے۔ ایسی اور اتنی احتیاطوں کے باوجود بعض اوقات نمائندہ قسم کے شاعروں میں سے کچھ بلانا پڑتا تھا۔ پھر نہ تو ادھر والوں کی حکمتِ عملی کام آتی تھی نہ اُدھر والوں کی، ایک "وف" (بمعنی فریق) کے شاعر ایک طرف بیٹھ گئے۔ دوسری وف کے دوسری طرف، اب اچھے سے اچھا شعر پڑھا جا رہا ہے مگر مخالف فریق ہُوں ہاں ہی نہیں کرتا۔ اسی طرح جب دوسرے فریق کی باری آتی تھی تو ادھر والے منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہتے۔ یعنی عجیب قسم کا بے ایمان ماحول ہوتا تھا۔ مگر بعض شاعر ایسے بھی ہوتے تھے۔ جو سر چڑھ کر بولتے تھے۔ ایسے ہی شاعروں میں حفیظ صاحب تھے۔

اگر میں اُن مشاعراتی معرکہ آرائیوں کا ذکر لے بیٹھوں گا تو بات بہت طول پکڑ جائے گی۔ سمیٹے نہ سمٹے گی اور اگر میں مشاعروں کو حفیظ صاحب کی زندگی سے خارج کر دوں تو ایسے ہی ہوگا، جیسے میرا ارادہ، پٹرول کے بغیر موٹر چلانے کا ہو۔ اس لیے اختصار کے ساتھ کچھ تو سُنیئے!

انھیں متعدد مشاعروں میں سر آنکھوں پہ بٹھایا گیا۔ خُوب خُوب داد ملی۔ مگر ایک واقعہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ شملہ میں مشاعرہ تھا۔ ہندوستان بھر کے چوٹی کے شاعر پہنچے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے اہلِ علم بھی موجود تھے۔ نواب امین الدولہ لوہارو مشاعرے کے صدر تھے۔ اُن دنوں سر عبدالقادر وزیرِ تعلیم تھے۔ انھی کے ایما پر مشاعرہ ہوا تھا۔ محمد علی جوہر بھی مشاعرے میں موجود تھے۔ خواجہ حسن نظامی بھی تھے۔ ڈاکٹر تاثیر سے ان کی پہلی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ رات گئے تک مشاعرہ چلتا رہا۔ ان کے کلام کو بہت پسند کیا گیا۔ بار بار پڑھوایا گیا۔ ان کے علاوہ کوئی صاحب بھی شاعر جم نہ سکا۔ اس پر خواجہ حسن نظامی نے ایک فقرہ چلا دیا " رات تو حفیظ کا نکاح ہو گیا "۔

" کس سے ؟ شہرت کے ساتھ !"

یہ فقرہ بہت چلا۔ کہ حفیظ کا نکاح ہو گیا۔ حفیظ کا نکاح ہو گیا۔ کئی لوگوں کو اصل واقعہ کا علم نہ تھا۔ استفسار حفیظ صاحب سے بھی ہونے لگا " سُنا ہے آپ نے نکاح کر لیا ہے ؟"

" جی ہاں !"

" کس سے ؟"

" یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ مگر نکاح خواجہ حسن نظامی نے پڑھوایا تھا "۔

ایبا سین اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام، ہر سال ایک مشاعرہ ہوتا تھا جشنِ خیبر کے نام سے، جہاں پاکستان کے تمام نامور شاعر پہنچا کرتے تھے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ایک سال

جن دنوں مسرور حسن خاں کمشنر تھے۔ انھیں بھی بلایا گیا۔ انھیں وہاں جانے میں تامل تھا کیونکہ اس مشاعرے کا انتظام، وہاں کا ترقی پسند گروپ کرتا تھا۔ یعنی مشاعرے میں اُن کا عمل دخل بہت ہوتا تھا جس سال کی یہ بات ہے۔ اُس رات، عین مشاعرے کے وقت بارش شروع ہوگئی۔ لوگ سُننے کے موڈ میں نہ رہے۔ اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ بھگدڑ مچ گئی۔

اوروں کی طرح حفیظ صاحب بھی، اپنی بڑائی کے اظہار میں، کبھی بھی اور کسی سے بھی پیچھے نہیں رہتے۔ چنانچہ یہ شعر پڑھنے سے پہلے تقریر کا بھی شوق فرماتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے شوق فرمایا اور بدمزگی ہوگئی۔ ان کا بیان ہے کہ بھگدڑ بارش کی وجہ سے مچی۔ ایک عینی شاہد کا بیان مختلف ہے۔ یعنی لوگ پہلے ہی بارش کی وجہ سے بیزار تھے۔ اُٹھ اُٹھ کر جا رہے تھے۔ اوپر سے ان کے ایک فقرے نے جلتی پر تیل ڈال دیا۔

جب یہ پڑھنے کے لیے اُٹھے تو کسی نے کہا "ابھی تو میں جوان ہوں" سنائیے کسی نے کہا "میرا اسلام لے جا" کسی نے کہا "رقاصہ"!

جو لوگ بارش کی وجہ سے بھاگ رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ہم نہیں سُنتے، ہم نہیں سُنتے! مگر شور یہ بھی تھا "رقاصہ، رقاصہ"!

لفظ رقاصہ کے جواب میں انھوں نے کہہ دیا "پہلے رقاصہ کے بچوں کو تو چُپ کرائیے" بس یہ سننا تھا کہ مجمع بپھر گیا۔ نوبت شہادت تک پہنچتے پہنچتے رہ گئی۔ یوں

ایک اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

جن دنوں ترکی میں زلزلہ آیا تھا۔ اُن دنوں بنگال کے وزیر اعظم (شیر بنگال) فضل الحق تھے۔ ترکی کی امداد کے لیے مشاعرے کا بھی انعقاد طے پایا۔ ہندوستان بھر کے شاعر پہنچے۔ سرکاری طور پر چندہ اکٹھا ہوا۔ مشاعرے کے ذریعہ بھی، رقم اکٹھی کرنا تھی۔ مشاعرے کی صدارت وزیر اعظم ہی کر رہے تھے۔ جب انھوں نے حفیظ صاحب کو نظم پڑھنے کے لیے کہا تو انھوں نے حاضرین سے کہا، "میں اُس وقت تک نظم نہ پڑھوں گا جب تک پچاس ہزار روپے اکٹھا نہ ہو جائیں"۔

"نظم پڑھیے، نظم پڑھیے"۔

"پہلے چندہ دیجیے۔ پورے پچاس ہزار!"

وزیر اعظم نے چپکے سے کہا "یہ رقم زیادہ ہے۔ اس پر اصرار نہ کیجیے۔ جو کچھ مل جائے۔ وہی ٹھیک ہے!"

چنانچہ میں نے لاؤڈ اسپیکر پر حاضرین کو بتایا کہ وزیر اعظم صاحب فرماتے ہیں کہ رقم زیادہ ہے۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ میں اُس وقت تک نظم نہ پڑھوں گا جب تک کہ مطلوبہ رقم پوری نہ ہو جائے۔

حیدرآباد دکن سے کمال یار جنگ بھی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے خاصی رقم دی۔ پنجابی سوداگران نے بھی دل کھول کر چندہ دیا۔ اُدھر لوگوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ "نظم پڑھیے، نظم پڑھیے"۔

وزیراعظم نے پھر کہا "حفیظ صاحب نظم پڑھیے۔ رقم کم بھی ہوئی تو کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن لوگوں کے اشتیاق میں مزید رخنہ نہ ڈالیں"

چنانچہ میں نے فضل الحق صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا "آپ بنگال کے شیر ہیں اور ایک پنجابی گیدڑ کو سپر ڈالنے پر مجبور کر رہے ہیں مگر میں ایسا نہ کروں گا اور اس وقت تک نظم نہ پڑھوں گا جب تک کہ واقعی پچاس ہزار کی رقم بطور چندہ جل نہیں جاتی" جب منتظمین نے یہ بتایا کہ رقم پچاس ہزار سے بھی زیادہ ہوگئی ہے تو اس کے بعد میں نے نظم پڑھی۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ حفیظ صاحب چندہ اکٹھا کرنے میں بڑے ماہر ہیں۔ یوں جتنا چندہ انھوں نے اکٹھا کیا۔ کم کسی نے کیا ہوگا۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہو تو اکڑ بیٹھ گئے چندہ دو گے تو نظم پڑھوں گا۔ قائد اعظم فنڈ ہو تو اڑ جائیں گے۔ پہلے چندہ بعد میں نظم، ریڈ کراس کا جلسہ ہوگا تو اصرار، چندہ جمع کیجیے۔ بندہ بھی حاضر ہے۔

ڈان کے مشاعرہ کے نام سے ایک مشاعرہ کراچی میں ہوا تھا۔ بتقریب قائد اعظم ریلیف فنڈ خوب ٹکٹ بکے۔ خوب لوگ پہنچے۔ اس سے پہلے قائد اعظم کی موجودگی میں ہی، حفیظ صاحب لاہور میں ایک نظم "شریفانہ اشارہ" پڑھ چکے تھے جو پسند کی گئی تھی۔ اس میں کچھ پنجاب کے وزیروں اور امیروں پر چوٹیں تھیں۔ چنانچہ لوگوں نے شور مچایا "شریفانہ اشارہ" "شریفانہ اشارہ!" ادھر سے انھوں نے کہا "میرا بھی ایک شریفانہ اشارہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے قائد اعظم ریلیف فنڈ میں چندہ دیجیے"

چندہ جمع ہونے لگا۔ اس کے دوران شور، نظم پڑھیے۔ نظم پڑھیے!
" ابھی پڑھتا ہوں۔ مگر پہلے یہ تو دیکھ لوں کہ آپ لوگوں نے کتنی شرافت کا ثبوت دیا ہے"۔ شعر پڑھنے سے پہلے اور دوران مشاعرہ، ان کی فقرے بازی جاری رہتی ہے۔ کبھی نتائج خوش گوار، کبھی ناخوش گوار!

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ قومی کاموں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے سلسلے میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ شاید پوری دنیا میں کوئی مدِمقابل نہ ہو۔ واہ وا کیا کیا اور کتنے سرخاب کے پر لگے ہیں ان میں!

انجمن حمایت اسلام کی ایک شاخ جالندھر میں بھی تھی۔ یہ انجمن کے جلسے میں چندے کی ایک مہم پہ کھڑے ہوئے۔ پہلے اپنی نظم سنائی۔ جب لوگ جھوم رہے تھے واہ کے ڈونگرے برسا رہے تھے تو انھوں نے بیچ ہی میں نظم پڑھنے سے انکار کر دیا۔ کہا۔ پہلے انجمن کو چندہ دیجیے۔ اس کے بعد نظم پڑھوں گا۔ چنانچہ لوگوں نے چندہ دینا شروع کر دیا۔

پھر انھوں نے نام لے لے کر چندہ اکٹھا کیا۔ مثلاً کہا" میں خیرو بن کی طرف دیکھ رہا ہوں"۔ جواب میں خیرو بن نے کہا" ایک ہزار روپیہ!" پھر انھوں نے سخاوت اللہ کی طرف دیکھ کر کہا" یہاں سخاوت اللہ صاحب بھی بیٹھے ہیں"۔" انہوں نے کہا" دو ہزار روپے"۔ پھر انھوں نے کہا" مسلمان تو چندہ اس لیے دے رہے ہیں کہ یہ ان کا قومی ادارہ ہے مگر میری نظر ایک ہندو سپوت نیکی رام پر بھی ہے"۔ نیکی رام نے کہا" تین ہزار"۔

غرض اسی طرح ہزاروں ہزار روپیہ اکٹھا کر لیتے ۔

ایک بار عجیب لطیفہ ہوا کہ ایسے ہی کسی موقع پر، کسی من چلے نے کہہ دیا "حفیظ صاحب آپ بھی تو کچھ دیں !"

انھوں نے جواب دیا "برخوردار، میں روپیہ نہیں دے سکتا، شعر دے سکتا ہوں بے شک جھولیاں بھر لو"

چندہ کی مہم رسانی کے متعلق صرف ایک اور اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک اشارہ! خلیفہ شجاع الدین جو انجمن حمایت اسلام کے صدر ہیں (تھے) اُن کی زبانی بھی دو کلمے سن لیجیے ۔

"شاہنامہ اسلام ایک ایسی بلند پایہ تصنیف ہے کہ اس کی وجہ سے حفیظ صاحب کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ لیکن حفیظ کے دیگر کارنامے بھی ایسے نہیں جن کو نظر انداز کیا جاسکے۔ بالخصوص ان کی وہ معرکہ آرا نظمیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں سنائیں اور جنھوں نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ ان کی وجہ سے انجمن کو ہزاروں روپیہ چندہ وصول ہوا۔ میں تو خاص طور پر حفیظ کا ممنون ہوں کہ کئی مرتبہ جب انھوں نے سالانہ جلسے میں تشریف لانے سے انکار کر دیا تو میری ذاتی درخواست پر وہ نہ صرف تشریف لائے بلکہ حاضرین کو اپنے کلام معجز نظام سے اتنا گرمایا کہ روپیہ کی بوچھار ہونے لگی ۔

یہ تو چندوں پر اصرار کیا کرتے تھے اور لوگوں سے رقم اکٹھی بھی کر لیا کرتے تھے

حالانکہ اس دَور میں ایسا ایسا شاعر پڑا ہے کہ اگر وہ صرف یہ اعلان کر دیں کہ ہم نظم نہیں پڑھیں گے تو لوگ اپنی خلاصی کے صدقے میں، خاصا چندہ دیں۔ وہ بھی بخوشی! رفاہی کاموں میں حفیظ صاحب کی اعانت ایک ناقابلِ فراموش رویہ ہے اور یہ مقام اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان سے سچی محبت اور مذہب سے والہانہ عشق نہ ہو۔ اس طور سے قوم نے اگر کسی کو نوازا تو وہ صرف چند ہستیاں ہیں جن میں سر سید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، علامہ اقبال اور یہ مشتِ خاک جسے ابوالاثر حفیظ کہتے ہیں۔

یہ اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب ہیں کہ ہر دَور میں اور ہر حکومت کے منظورِ نظر رہے۔ والیانِ ریاست کے بھی منظورِ نظر، امراء و رؤسا کے بھی منظورِ نظر، غرض انگریز کے دورِ حکومت میں بھی انھیں اپنی چاکری کے سلسلے میں اُونچی ہی مسند پہ بٹھایا گیا۔ حکومتِ پاکستان نے بھی، جگہ نہ ہونے کے باوجود جگہیں نکالیں اور اُن پہ ان کا تقرر کیا گیا۔ یہ شرف صرف انھیں ہی حاصل رہا۔ صرف انھیں ہی، اب جاکر، ویسا ہی چکر جوش ملیح آبادی نے بھی چلایا کہ کوئی کام نہیں مگر ہیں نوکر، پیچھے رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ان دنوں آزردہ ہیں۔

انگریز نے جنگ کے دنوں میں، انھیں اپنا سونگ پبلسٹی آرگنائزر بنا دیا۔ تاکہ لوگوں کو ورغلایا جائے اور فوج میں بھرتی کرایا جائے۔ چنانچہ شہروں اور دیہاتوں میں، اس محکمے کے زیرِ اہتمام، خوب رنگا رنگ پروگرام چلے۔ وہ ناچ رہی ہے۔

یہ گا رہا ہے قسم کا ماحول تھا اور تو کسی سونگ پبلسٹی کے دفتر کا حال مجھے نہیں معلوم، مگر لکھنؤ کے سونگ پبلسٹی آفیسر کے ہاں (شوکت تھانوی کے ہاں) میرا خوب رہنا سہنا رہا۔ میں دیکھتا تھا کہ وہاں آج ایک بائی جی آرہی ہیں تو کل دوسری، غرض خوب خوب طبلے اور سارنگیاں بجیں۔ کبھی کبھی تو اُن دنوں میں سوتے میں بھی اُٹھ بیٹھتا تھا اور پوچھتا تھا" اماں یار! یہ کیا حرکت ہے؟" مگر پھر سوجایا کرتا تھا۔ اس لیے کہ ہر آدمی کے میدان مختلف ہوتے ہیں۔ غرض ہر چند کہ وہ محکمہ عجیب قسم کے کام پہ مامور تھا، مگر حفیظ صاحب کی چھچھی حس نے اس محکمے کو قابلِ تحسین بنا دیا تھا۔

اساتذہ میں یہ داغ کے رنگِ تغزل کے مداح ہیں۔ داغ کی زبان، طرزِ بیان اور بے ساختگی پر ریجھے ہوئے ہیں۔ ایک دن کہا کہ میں ابتدا میں، مشق کے طور پر داغ ہی کے رنگ میں شعر فرمانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی داغ کی غزل میں اپنے بھی ایک دو شعر چپیکنٹ کر اہلِ کمال تک کو سنا دیا کرتا تھا۔ بیشتر ایسا ہوا لیکن کسی نے بھی یہ نہ کہا "حضرت یہ یہ اشعار تو داغ کے نہیں۔ یوں میری مشق بھی ہو جایا کرتی تھی اور اپنے اوپر اعتماد بھی بڑھتا جاتا تھا۔

پھر یہ بھی بتلایا۔ لکھنؤ والے داغ کو مانتے نہ تھے۔ گالیاں دیتے تھے — عبدالرؤف عشرت کی کتابوں کی دکان تھی۔ وہاں پہ کچھ حضرات بیٹھے داغ کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد، اُنھوں نے مجھے اپنا کلام سنانے کے لیے کہا تو میں نے شرارتاً داغ کی ایک غیر معروف سی غزل سنانی شروع کر دی۔

ہر ہر شعر پر انھوں نے داد دی۔ حفیظ صاحب بہت خوب، واللہ بہت خوب!

"یہ غزل تو داغ کی تھی"

"جی ہاں!"

"جبھی ـــــ جب ہی ـــــ جب!!"

۷ ستمبر ۱۹۷۰ء کو الیکشن کے روز ٹیلی ویژن پر ایک مشاعرہ بھی برپا تھا۔ جس میں اور اچھے شاعروں کیساتھ فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری اور جوش ملیح آبادی بھی شریک ہوئے تھے۔

جب سب پڑھ چکے تو آخر میں جوش صاحب کو پڑھوایا گیا۔ جوش صاحب کے شعروں پر سب نے داد دی۔ مگر حفیظ صاحب دم سادھے بیٹھے رہے بلکہ قدرے تکدر کے عالم میں بیٹھے رہے۔ اسی عرصے میں کیمرہ مین کو شرارت سوجھی تو دیکھا گیا کہ حفیظ صاحب نفرت جمع حقارت ایسی نظروں سے جوش صاحب کو دیکھ رہے ہیں۔ اس سین پر ناظرین کو بھی ہنسی آگئی۔

چنانچہ انھی دنوں میں نے پوچھا "جناب! جوش صاحب سے ناراض ہیں کیا؟"

"اس سے ناراض نہیں ہوں۔ اس کی شاعری سے ناراض ہوں"

"کیا معنی؟"

"وہ شاعر نہیں۔ ٹینک بند ہے"

"ٹینک بند نہ کہیے۔ ان کے ہاں تو الفاظ اور خیالات آبشار کی طرح

گرتے ہیں "

" خیالات نہیں الفاظ گرتے ہیں "

" کیا یہ کم خوبی ہے ؟"

" الفاظ کے لیے لغت دیکھی جا سکتی ہے ۔ پٹھانی لہجے میں شعر سننے کی کیا ضرورت ہے "

---

o

میں جس مشاعرے میں جاتا ہوں۔ لوگ میرے مائیکروفون کے سامنے آتے ہی کہنا شروع کر دیتے ہیں " رقاصہ! رقاصہ! مگر میں اُسے پڑھنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میرے سامنے قوم کی مائیں اور بیٹیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔"

"میں نے تو سُنا ہے کہ آپ نے ایک بار اُدھر ہی اشارے کر کر کے شعر پڑھے تھے اور لوگ حیران ہوئے تھے۔"

"صرف ایک مرتبہ!"

"آخر کیوں؟"

حفیظ صاحب نے میری کیوں کا جواب نہ دیا۔ بات کا رُخ موڑ دیا "کیا تمہیں اس نظم کا پس منظر معلوم ہے؟"

"نہیں!"

"تو سنو! یہ نظم میں نے والیٔ ..... کے دربار میں پڑھی تھی۔ کیونکہ میں ریاست کا ملازم تھا یعنی درباری شاعر، مجھے تین سو روپے ماہوار بہ طور وظیفہ ملتے تھے۔ نواب صاحب نے ایک رنڈی سے شادی کر رکھی تھی۔ اس رنڈی کو میں جانتا تھا۔ وہ مجھے جانتی تھی۔ چنانچہ اُس نے پیغام بھجوایا "حرام کی کھاتے ہو۔ دربار میں قصیدہ پڑھو" میں نے حکم کی تعمیل کی اور نواب صاحب اور اُس کی موجودگی میں بلکہ بھرے دربار میں اشارے کر کر کے کہا:

تیرا تھرکنا خوب ہے　　　تیری ادائیں دل نشیں
لیکن ٹھہر تو کون ہے　　　او نیم عریاں نازنیں
کیا مشرقی عورت ہے تُو　　　ہرگز نہیں، ہرگز نہیں

نواب صاحب میرے اشاروں کی طرف متوجہ تھے مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ جب میں نے زیادہ واضح اشارے کے ساتھ پڑھا:

سچ سچ بتا تُو کون ہے　　　او بے حیا تُو کون ہے

تو نواب صاحب کا رنگ فق ہوگیا۔ آن کی آن میں چہرہ غضب ناک ہوگیا۔ بہرحال میں کہتا گیا:

ہٹ سامنے سے دُور ہو　　　مردُود ہو، مقہور ہو
تقدیر کی ہیٹی ہے تُو　　　شیطان کی بیٹی ہے تُو

جب میں مندرجہ بالا شعر پڑھ رہا تھا تو نواب صاحب مارے غصّے کے کانپ رہے تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو تھوڑی دیر بعد مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ اگر سر عبدالقادر وہاں نہ ہوتے تو شاید میری لاش وہاں سے آتی۔ بہر حال مجھے فوری طور پر ریاست چھوڑ دینے کا حکم دے دیا گیا۔

یہ نڈر تو تھے ہی، چنانچہ ایک اور واقعہ سُنیے، یہ واقعہ ۱۹۱۹ء کا ہے کہ جب یہ پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ قصّہ یہ ہے کہ جب یہ جالندھر میں اپنے شعری کارناموں کی وجہ سے پہچانے جانے لگے تھے تو بھنک ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے کانوں میں پڑی۔ کچلو نے حفیظ صاحب سے کہا "کانگریس کا پرسوں ایک جلسہ ہونے والا ہے۔ اس کے لیے بھی نظم لکھو"

انھوں نے کہا "وہ جلسہ تو سیاسی ہے۔ میرا مسلک یہ نہیں"

"ہندوستان سے انگریزوں کو بھگانا سارے ہی ہندوستانیوں کا فرض ہے اس لیے —"

"میں! — میں!!"

"ہیں، ہیں کچھ نہیں۔ کیا انگریزوں نے تمھارے دادا کے ساتھ ظلم نہیں کیا تھا؟ کیا انگریز ہمارا خون نہیں چوس رہا؟ کیا انگریز ہندوستان کی دولت سمیٹ کر نہیں لے جا رہا؟ اگر یہ سب کچھ ٹھیک ہے تو پھر تم بھی اپنا قلم سنبھالو اور ایک آتشیں قسم کی نظم کہہ ڈالو"

اس تلقین کے بعد، جب حفیظ صاحب نے نظم لکھی اور پڑھی تو انھیں جلسے کے دوسرے روز گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد جلیانوالہ باغ کا واقعہ رونما ہوا۔ غرض اُن دنوں یہ تین ماہ کے قریب قید رہے۔

یہ بھی عجیب واقعہ ہے کہ یہ جس انگریز کے خلاف نظم پڑھنے کے سلسلے میں گرفتار ہوئے تھے۔ بعد میں اُسی انگریز کی نوکری کر لی۔ یعنی دوسری جنگ عظیم کے وقت، یہ ایک محکمے کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ کام لوگوں کو فوج میں دھکیلنا تھا۔ چنانچہ اسی شوق میں برما کی سرحد بھی پار کر گئے تو انھیں پکڑ لیا گیا۔ بعد میں اُنھوں نے انھیں صرف شاعر سمجھ کر چھوڑ دیا۔ پھر بھی انھیں پچیس دن تک اپنا مہمان رکھا۔ رہائی کے بعد انھیں کلکتہ تک پیدل سفر کرنا پڑا۔ یہ اُس سفر کی بڑی عبرت ناک تصویر کھینچتے ہیں۔ مگر ہمیں اس وقت صرف ان کی گرفتاری سے غرض ہے۔ ان کی بپتا سے نہیں۔

ایک دن حفیظ صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ سر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "دیکھ رہے ہو؟" پھر اُونچی آواز میں فرمایا "دیکھ رہے ہو؟"

"جی ہاں سر ہے۔"

"سر نہیں، خُون!"

"خُون؟"

"ہاں خُون!"

"میں سمجھا نہیں۔"

میری بات کوئی نہیں سمجھتا۔ یہ تو تمہیں علم ہے کہ میں موربل آفیسر ہوں۔ محاذ پر گیا تھا۔ یہ وہاں سے ؟"

" یہ سر وہاں سے ملا ؟"

" نہیں پیارے نہیں۔ میں آزاد کشمیر میں فوجیوں کا موربل بڑھانے کے لیے، اگلے مورچوں پہ چلا گیا تھا۔ دشمن نے بم پھینکا۔ وہ، وہ !"

" جی ؟"

" وہ لگا۔ وہ لگا۔ سر پھٹ گیا۔ بیہوش ہو گیا۔ یہ وہ، یہ وہ !"

حفیظ صاحب ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے خلاف ہیں۔ یہ فیض، ندیم، ساحر اور علی سردار جعفری کو اچھا شاعر نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ نظم میں کمیونزم کو رکھ دیتے ہیں۔ شاعری کے لیے حسن حسن کی ضرورت ہے۔ وہ ان کے ہاں عنقا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں بے شک ان میں پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں۔ مگر وہ بھی جادۂ حق سے ہٹے ہوئے ہیں۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ ان میں سے بعض میں بے پناہ شعری صلاحیتیں ہیں۔ مگر نقطۂ نظر غلط ہو جانے کی وجہ سے، شعر سے متعلق جو نزاکتیں اور رعنائیاں ہوتی ہیں۔ وہ ان کے ہاں ڈھونڈے سے نہیں ملتیں۔ فیض کی ایک نظم ہے۔ "کم بیک افریقا" کیا یہ نظم ہے ؟ ندیم کی نظم "چل مشین چل" نظم ہے ؟ علی ہذا القیاس !"

میں نے کہا" میں نے تو خود ایک نشست میں، آپ کو ندیم صاحب کے شعروں

پر داد دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ بُری طرح لوٹ رہے تھے "

" بڑھاوے دینا میرا اخلاقی فرض ہے "

" کیا اخلاقی فرض میں جھوٹ بولنا بھی شامل ہوتا ہے ؟"

" نہیں !"

" پھر ؟"

" پھر یہ کہ جب یہ لوگ شاعر بن کر شعر کہتے ہیں تو لُطف آتا ہے۔ اس وقت میں اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر حق ادا کرتا ہوں۔ جب یہ لوگ منشور کو سامنے رکھ کر شعر کہتے ہیں تو میں کہتا ہوں۔ یہ منصب شاعر کا نہیں، ایسی صورت میں انھیں شاعر بھی کیوں مانوں؟"

یہ ترقی پسند ادیبوں کے خلاف ہیں۔ جس کا اظہار میں پہلے بھی کر چکا ہوں اور یہ بھی اس امر کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ کبھی لکھ کر، کبھی زبانی مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ بات صرف نظریاتی حد تک ہے، جنون کی حد تک نہیں۔ کیونکہ میں نے انھیں خود ترقی پسند ادیبوں کی ایک کانفرنس میں نظم پڑھتے سُنا ہے اور وہ نظم ہے "اب جیب بھٹے گا دیوانہ" جس کے "بول" ہیں ۔

زور آوری سے کمزوروں کی
اب جیب کٹے گی چوروں کی
اور منڈی ساہوکاروں کی
اِک بھوکی "ہُو حق" سیر کرے گی

منڈیوں اور بازاروں کی
گت دیکھ کے دُنیا داروں کی
اب خُوب ہنسے گا دیوانہ

(۲)

اب وال نہ جاگیروں کی گلے گی
آگ مگر دن رات جلے گی
چمڑے کے تنوروں میں
اب کال پڑے گا غلّے کا

بیوپاریوں بے مقدروں میں
اب پیٹ بھرے مزدوروں میں
اب خُوب ہنسے گا دیوانہ

(۳)

اب گاڑھا پسینہ بُننے والے
اوڑھے پھریں گے شال دوشالے
مُفت نہ جھُولے جھُولیں گی
پھُولے مُوٹے گال اب پچکیں گے
پچکی ہوئی توندیں پھُولیں گی
سب عقلیں چوکڑی بھُولیں گی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

جب حفیظ صاحب یہ نظم پڑھ چکے تو میں نے اپنے ایک دوست سے کہا "صاحب آج تو حفیظ صاحب بڑے بڑے ترقی پسندوں سے بازی لے گئے "

" ہاں صاحب! آج تو یہی ہُوا "

عرصے بعد، اُسی نظم اور اُسی جلسے کا ذکر حفیظ صاحب سے بھی ہوا۔ کہنے لگے ہاں میں نے وہ نظم اُس جلسے میں پڑھی تھی۔ غریبوں، ناداروں سے ہمدردی کس کو نہیں ہوتی اس ضمن میں میرے محسوسات بھی وہی ہیں جو ترقی پسندوں کے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں محمدؐ کا نام لیوا ہوں۔ وہ کارل مارکس کا!"

حفیظ صاحب نے فرمایا" ایک زمانے میں، ترقی پسند ادیبوں نے شاہنامہ اسلام کے بارے میں، یہ پراپیگنڈہ کیا کہ یہ کتاب کوئی شاعری کی کتاب نہیں بلکہ اسلامی افسانوں کی کتاب ہے "

" افسانوں کی کتاب ؟"

" ہاں افسانوں کی کتاب!"

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کا نمونہ نہیں ہے تو وہ اور بات ہے مگر تاریخی حقائق کو افسانے کہنا مناسب نہیں "۔

حفیظ صاحب نے وضاحت کی "اسلام سے ترقی پسندوں کو جو بُعد ہے اس کا اظہار وہ اکثر و بیشتر اور موقعہ بے موقعہ کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ میں ان کے لیے ترنوالہ ہوں۔ اس لیے مجھے ہدف بناتے ہیں "

" نظریے کی بات ہے ۔ ذاتی تو کوئی مخالفت نہیں "۔

" نظریے کی بات کا بھی سن لو ۔ شاہنامہ اسلام نہ صرف واقعاتِ اسلام کی منظوم تاریخ ہے بلکہ اس میں ترقی پسندوں کے مسلک کی بھی تائید ملتی ہے "۔

" یعنی آپ نے اسلام میں کمیونزم کو داخل کر دیا ؟"

" یہ بات نہیں !"

" جناب وضاحت فرمائیے ۔ آپ کے اس ارشاد سے تو ہکا بکا رہ گیا ہوں "۔

" میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شاہنامہ میں مولویت کے خلاف مواد ہے ۔ موجودہ تعلیم کی خرابیوں کے خلاف مواد ہے ۔ انگریز کے خلاف مواد ہے ۔ یہی "موٹو" ان کے ہیں ۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ میں مذہب کے خلاف نہیں لکھتا "۔

میں نے چھیڑا " لکھیے "۔

" میں اپنے ہاتھ سے اپنی شہ رگ کو کیسے کاٹ دوں !"

حفیظ صاحب کو شکایت یہ بھی ہے کہ ترقی پسند ادیب مجھے جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہیں اور یہ رویہ ان کا پہلے دن سے ہے ۔ مشاعروں میں بھی جوش اور فیض کے اشعار پر واہ واہ کریں گے ۔ شاعری پر جب بھی مضمون لکھیں گے تو اس میں میرا ذکر ہی نہ ہوگا ۔ برعکس اس کے اُن شاعروں تک کا ذکر کریں گے جو بالکل نوآموز ہوں گے "۔

میں نے کہا " حفیظ صاحب یہ صرف آپ کے ساتھ نہیں ہے "۔

" صرف میرے ساتھ ہے "۔

"حسرت موہانی کا ذکر نہیں کرتے ۔ جگر مراد آبادی کا ذکر نہیں کرتے ۔ اصغر گونڈوی کا ذکر نہیں کرتے "

"کیوں نہیں کرتے ؟"

"ایک تو اس لیے نہیں کرتے کہ آپ اس تحریک سے پہلے کے شاعر ہیں ۔ آپکا اپنا ایک دور تھا ۔ اس دَور کے شعرا میں آپ کا ذکر یوں بھی بھلا نہیں لگتا "

اگر یہ بات ہے کہ میں اُن سے پہلے کا شاعر ہوں تو پھر یہ لوگ جوش کا ذکر کیوں کرتے ہیں ۔ وہ بھی تو میرے دور کا شاعر ہے "

یہ بات ٹھیک ہے کہ جوش آپ ہی کے دَور کے شاعر ہیں ۔ مگر اُن کے اور آپ کے نظریاتِ شعری میں فرق ہے ۔ وہ انسان انسان پکارتے ہیں ۔ آپ قرآن قرآن !"

طفیل اگر یہ فرق ہے تو پھر خدا کی قسم مجھے کوئی گلہ نہیں !"

اُدھر دنیا ہے اور دُنیا کے بندے

اِدھر میرا خدا ہے اور مَیں ہوں

اُڑان ان کی بہت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نقوش کے غالب نمبر میں غالب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ " میری ابتدائی مشق غالب سے بہتر تھی "

مضمون چھپنے سے پہلے، میں نے ان سے کہا " اس رائے سے لوگ ناراض ہوں گے ۔ بہتر یہ ہے کہ اس فقرے کو حذف کر دیا جائے "

حفیظ صاحب نے فرمایا "ایسا نہ کرنا۔ یہ رائے میری ہے۔ تم چھاپو!"

"لوگ بُرا بھلا کہیں گے "

"گالیاں دیں گے ؟"

"ہو سکتا ہے!"

"پھر ضرور چھاپو۔ اس لیے کہ زیادہ تر گالیاں اچھا کام کرنے والوں کو یا اچھی بات کہنے والوں کو دی جاتی ہیں "

"آپ اس فقرے کی اشاعت پر اصرار نہ کریں تو اچھا ہے "

"دیکھو بھئی، میں بات غالب کی اُردو شاعری کی کر رہا ہوں۔ غالب کی ابتدائی اُردو شاعری، اُردو شاعری نہیں بلکہ سراسر فارسی ہے۔ اُردو تو وہ برائے نام ہے "

اس بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے پوچھا "آپ نے پاکستان کا ترانہ اُردو میں لکھا ہے ؟"

"ہاں! اُردو ہے "

"اس میں اُردو کا صرف ایک لفظ "کا" ہے۔ باقی فارسی!"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ایسے فارسی الفاظ چُنے۔ جو عام طور سے اُردو میں مستعمل ہیں "

"اگر غالب زندہ ہوتے تو وہ بھی یہی بات کہہ سکتے تھے "

"وہ ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے کہ اس کی ابتدائی شاعری اُردو کی شاعری نہیں ہے"

" میں آپ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوں "

" دیکھو ہمارے پڑوس میں افغانستان ہے۔ ایران ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میں ایسی زبان استعمال کروں، جسے ہمارے پڑوسی بھی سمجھ سکیں "

حفیظ صاحب اچھے خاصے آدم بیزار ہیں۔ اسی بنیاد پر مجھے ایک صاحب سے ہمدردی بھی تھی اور وہ صاحب ہیں پروفیسر محمد منوّر، ایک دن پروفیسر صاحب ملے تو میں نے اُن سے کہا " آپ کا حوصلہ قابلِ داد ہے! "

" وہ کیسے ؟ "

" وہ ایسے کہ آپ کئی برس سے حفیظ صاحب کے ساتھ رہ رہے ہیں "

پروفیسر صاحب ہنسے، کہنے لگے " حفیظ صاحب کے بارے میں میری رائے لوگوں سے مختلف ہے۔ میری ان کے درمیان کبھی بدمزگی نہیں ہوئی۔ اوّل تو وہ میرے ساتھ زیادتی نہیں کرتے۔ بلکہ میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ عموماً شفقت ہی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ کبھی چھوٹی موٹی بات ہو جاتی ہے تو میں درگزر کر لیتا ہوں۔ اور اگر کوئی بات میرے لیے درگزر کی حد سے باہر ہوتی ہے تو پھر میں خود ہی ان سے نپٹ لیتا ہوں۔ مطلب یہ کہ " موقع واردات " پر ہی جملہ معاملات صاف ہو جاتے ہیں۔ تکدر دھل جاتا ہے "

یہ باتیں سُنیں تو میں نے کہا " حیرت ہے۔ لوگوں کی رائے تو یہ ہے کہ حفیظ صاحب بہت چڑچڑے ہیں۔ بات بات پر خفا ہوتے ہیں۔ اپنے علاوہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتے "

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ ان کے متعلق تو یہ بھی مشہور ہے کہ وہ بڑے کنجوس ہیں۔ حالانکہ وہ کئی محتاجوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ مالی فائدے پہنچاتے ہیں۔ ان کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے ہیں۔"

میں نے پروفیسر صاحب سے کہا "اچھا ہوا آپ سے اس موضوع پر بات ہوگئی۔ ورنہ میری رائے کچھ ایسی ویسی ہی تھی۔"

اس پر منور صاحب نے کہا "خدا جانے تُو نے اُسے کس آن میں دیکھا۔"

یہ عجیب وہمی آدمی ہیں۔ پچھلے دنوں اُنھوں نے ایک ایسے نیک اور صالح نوجوان کو اپنے پاس بلانا شروع کیا۔ جوان کی سوانح لکھنے میں مدد دیتا رہا۔ یہ بولتے رہے وہ لکھتا رہا۔ یہ سلسلہ چند ہی روز چلا ہوگا کہ ایک دن انھوں نے اس نوجوان کی موجودگی میں بیوی کو آواز دی۔ "مجھے دوائی دے جاؤ۔" جب ایک دو آوازیں اس نیک بخت نے نہ سُنیں تو نوجوان نے کہا "قبلہ میں لا دُوں؟"

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ کہاں رکھی ہے؟"

"جی ہاں!"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو گھر میں گھومتا رہتا ہے۔"

وہ چُپ رہا۔ وہ کیا جواب دیتا۔ بجز شرافت و نجابت، اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ مگر حفیظ صاحب نے اس سے کہہ دیا۔ "آئندہ اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔" اور وہ سوانحی سلسلہ ختم ہوگیا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حفیظ صاحب بے حد شکّی مزاج ہیں۔ دوسروں پر بھروسا کم کرتے ہیں۔ اس لیے خواہ مخواہ تکدر بڑھتا ہے۔ حالانکہ اصلیت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ رشتہ داروں سے بدگمانیاں، دوستوں سے بدگمانیاں، ملنے والوں سے بدگمانیاں!

ایک دن میں نے ان کے اس رُخ کی طرف اشارہ کر کے جواب چاہا تو انھوں نے کہا "خُدا کی قسم مجھ سے کسی نے وفا نہیں کی۔ اس لیے طبیعت میں وہمی پن پیدا ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات دوستوں اور عزیزوں کے خلوص پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔

○

" ابھی تو میں جوان ہوں " کہنے والے شاعر ہیں، ظاہر ہے کہ کچھ شرارے بھی
ہوں گے۔ جبھی تو ایک شادی کے بعد دوسری شادی کی۔ پھر تیسری شادی کی۔ ارادہ
چوتھی کا بھی ہے۔ شرعی اجازت جو ہے۔ مگر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ ان کے ارادوں
پہ اوس پڑتی ہے یا کسی خاتون کے بھاگ کھلتے ہیں۔ بہرحال یہ معاملات تو ان
کے شرعی ہیں۔ کچھ غیر شرعی معاملات ہیں کہ نہیں۔ مجھے نہیں معلوم، ویسے میرا دل
کہتا ہے کہ اس معاملے میں بھی کسی سے پیچھے نہ ہوں گے۔ کھوج کا ارادہ اس لیے
نہیں کہ شاعرِ اسلام ہیں یہ! پھر اب میں یہ سوچنے لگ گیا ہوں کہ دشمنیوں کے
اس دور میں، جو جس سے محبت کر رہا ہے۔ بے شک کرتا رہے۔ کیا حرج ہے؟
اسی بنیاد پر، میں ان کا ایک بے ضرر سا واقعہ سنانے لگا ہوں۔ شرعی حد ہے
کہ نہیں۔ یہ آپ جانیں!

اختری بائی فیض آبادی کی ایک زمانے میں دھوم تھی۔ صورت بھی اچھی تھی۔ آواز میں بھی لپک تھی۔ مگر یہ اس زمانے میں شاعر تو اچھے تھے مگر صورت ایسی ہی تھی۔ اس کے باوجود ایک تقریب میں، اختری ان سے مانوس ہوگئیں۔ اُس نے انھیں گھر پر آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ایک دن چل پڑے۔ جا کنڈی کھٹکھٹائی!

استقبال کے لیے نائیکہ پہنچیں۔ اُنھوں نے کہا " میں اختری بائی سے ملنا چاہتا ہوں "

نائیکہ نے ان کی صورت دیکھی تو اپنے دھیان جان گئی کہ گاہک تو کچھ لمبا اودیا سا ہی نظر آتا ہے، اس لیے ٹرخا دینا چاہیے۔ چنانچہ نائیکہ نے کہا " جائیے جائیے۔ راستہ ناپئے۔ وہ نہیں مل سکتیں "

" مجھے انھوں نے ـــــ "

" جانتے ہیں کہ نہیں ؟ ورنہ مجھے کوئی دوسرا کہیں دکھانا پڑے گا "

یہ جتنے بچھے جارہے تھے۔ یا جتنی نرم روئی کا استعمال فرمارہے تھے وہ اُتنی تُرش رُوئی سے پیش آرہی تھی۔ یہ چپ چپ کی تفسیر، وہ شپ شپ کی تعبیر، چنانچہ اس ہائے ہُو کی بھنک اختری کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکا تو دیکھا کہ ان کے در پر فردوسِ اسلام کھڑے ہیں۔ چنانچہ وہ ننگے پاؤں نیچے بھاگی اور نائیکہ سے حفیظ صاحب کو چھڑایا۔ اُوپر لے گئیں۔ جب وہ اوپر یہ فاتحانہ انداز میں بیٹھ گئے تو اس وقت حفیظ صاحب پر ایک شعر نازل ہوا۔

دربان سے ہوں دست و گریباں
الحمد للہ یہ باریابی

اس کے بعد وہ پوری غزل اختری بائی کے سراپا اور اپنے احوال سے متعلق کہی۔ سراپا ملاحظہ ہو ؎

آنکھیں سیہ مست، چہرہ کتابی ۔۔۔ بادہ شبانہ جام آفتابی
پھولوں میں دو پھول سنگوں میں دو رنگ ۔۔۔ لب لعل نابی، عارض گلابی

پھر اپنا حال یوں بیان فرماتے ہیں ؎

دل اور دیں سے بیگانہ ہو جا
دیوانہ ہو جا بن جا شرابی

اس کے بعد ذرا سنبھلتے ہیں۔ کچھ اُسے سمجھاتے ہیں۔ کچھ اپنی اَنا کا خیال آتا ہے فرماتے ہیں ؎

اُن کا بہانہ برجستہ گوئی ۔۔۔ میرا تبسم حاضر جوابی
ہیں تختِ دل پر سرکار ورنہ ۔۔۔ تختہ اُلٹ دیں ہم انقلابی

تختہ اُلٹ دیں ہم انقلابی، یہ مصرعہ اگر حفیظ صاحب نہ کہتے تو میں ضرور حیران ہوتا۔ اس لیے کہ یہ طنطنہ تو حفیظ صاحب میں ہے جو وقت دلربائی بھی کہیں بھاگ نہیں سکتا اور جو وقتِ امتحان بھی انھیں دغا نہیں دے سکتا۔ یہ ٹوٹتے ٹوٹ جائیں گے مگر "لچکائیں گے" نہیں۔ جبھی تو اتنی کارروائی پر بھی کہا ؎

دربان سے ہوں دست و گریباں
الحمد للہ یہ باریابی

آپ اور باتیں جانے دیں ۔ صرف لفظ الحمد للہ کا استعمال دیکھیں کہ موقع واردات کی کس نہج پر کیا گیا ہے ۔ ایک اور موقعہ پر بھی ، انھوں نے بہ طور سند فرما رکھا ہے ۔

سنا ہے کیا حیرت انگیز قصے

حسینوں میں کھوئی ہو جس نے جوانی

واللہ اعلم یہ شعر جھوٹا ہے یا سچا ، ویسے حفیظ صاحب جھُوٹ کم ہی بولتے ہیں ۔ از رہ کرم ایک بار پھر سُن لیں ۔ حفیظ صاحب جھُوٹ کم ہی بولتے ہیں ۔

پہلے بھی کہہ آیا ہوں کہ حفیظ صاحب نصیبے والے ہیں ۔ معمولی پڑھے لکھے مگر دُنیاوی طور پر اتنی اُونچی اُونچی نوکریوں پر رہے کہ سی ۔ ایس ۔ پی افسر بھی رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں گے ۔ ابتدائی دور میں بے شک سو پچاس کی نوکریاں کرتے رہے مگر جب ایک دم اُبھرے تو پھر ہزار ، ڈیڑھ ہزار ، دو ہزار سے کم نوکری نہ کی اور یہ باتیں اُن دنوں کی ہیں کہ جب روپے کی خاصی قیمت تھی ۔

شاہنامہ اسلام کے مصنّف ہیں یہ ، جدھر سے گزرتے ہیں ۔ لوگ راستے میں آنکھیں بچھا دیتے ہیں ۔ جتنی عزت و تکریم ان کی ہوئی ۔ کم کسی کی ہوئی ۔ گھر گھر ان کا پیغام پہنچا ۔ مسجد مسجد کلام پڑھا گیا ۔ محفلوں میں ان کا جادو چلا ۔ درباروں میں ان کا طوطی بولا ۔ اس کے باوجود ان کی زندگی کا ایک پہلو بڑا دردناک ہے اور وہ پہلو ہے ان کی گھریلو زندگی کا !

پہلی بیوی پسند نہ تھی ۔ زبردستی کی شادی تھی ۔ دوسری بیوی سفید چمڑی والی تھی ۔

خیالات میں بُعد تھا۔ موجودہ بیوی ریڈیو آرٹسٹ تھی۔ جیسے تیسے نبھ رہی ہے۔ دونوں ہی خوش نہیں یا دونوں بہت خوش ہیں۔

حفیظ صاحب کے ہاں اولادِ نرینہ نہیں۔ بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں۔ کوئی کسی بیوی سے، کوئی کسی بیوی سے، اس لیے سگی ماں اور سگے باپ والا پیار کم کسی کو ملا۔ بدمزگی ہی بدمزگی رہی۔ ایک بیٹی تسنیم تو آخر آخر میں پاگل ہوگئی تھی۔ حالانکہ اچھی خاصی شاعرہ تھی۔ تسنیم حفیظ کے نام سے مشاعروں میں شریک ہوتی تھی۔ اپنا رنگ جماتی تھی۔ جس مشاعرے میں باپ جاتے تھے تسنیم نہ جاتی تھی جس میں تسنیم پہنچ جاتی تھی۔ باپ نہیں پہنچتے تھے۔ غرض ایک دوسرے کو، آپس میں شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔ گھر کا سکون عنقا ہی عنقا تھا۔ گھر کے تمام افراد میں ایک دوسرے سے بیزاری ہی بیزاری تھی۔

مندرجہ بالا چند سطور کا مقصد، حفیظ صاحب کی گھریلو زندگی کے کسی بھی تاریک پہلو کو سامنے لانا نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں عرض صرف اتنا کرنا ہے کہ حفیظ صاحب ایسے دردناک ماحول میں بھی زندہ رہے۔ لکھتے رہے۔ دنیائے شاعری پر چھائے رہے۔ انھوں نے ہمیشہ ہی اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کی مدد کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد، جب سب لُٹ لٹا کر جالندھر سے آئے تو انھوں نے سب کو سہارا دیا۔ کسی کو روپے پیسے سے سہارا دیا۔ کسی کو اپنے ہاں جگہ دے کر آنسو پونچھ ڈالے۔

ایک بھانجے کو اپنے پبلشنگ ہاؤس کا، یعنی مجلس اُردو کا کرتا دھرتا بنایا۔

برسوں کتابیں چھپتی اور بکتی رہیں۔ آخر میں جاکر نہ جانے کیا پھیر پڑا کہ ان کے بھانجے نے بتایا کہ ماموں نے میرے ساتھ زیادتی کی ۔

" کیا زیادتی کی ؟"

" افسرانِ بالا سے مل کر مجھے تھانے بلوایا گیا۔ گرفتار کرایا گیا۔ دکان کی چابی مجھ سے زبردستی لی گئی ۔

" کیا آپ دکان کے مالک بننا چاہتے تھے ؟"

" نہیں !"

" پھر ؟"

" ماموں دکان کا سودا کرنا چاہتے تھے ۔ میں اس میں مزاحم تھا ۔"

حفیظ صاحب اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ انھیں زندگی میں کئی چاہنے والے ملے ۔ کوئی دو چار برس جان چھڑک کر الگ ہوگیا۔ کچھ چھ سات سال تک چلے ۔ کچھ اس سے بھی زیادہ دُور تک گئے ۔ مگر آخر تک کسی نے ساتھ نہ دیا ۔ معلوم نہیں یہ قصور ان کا ہے یا ان کے جاں نثاروں کا ، چند نام جو مجھے معلوم ہیں ۔ اُن میں پنڈت ہری چند اختر، سیّد ضمیر جعفری، ضیاءُ الاسلام اور عزیز ملک خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

ان عشاق میں، اب ایک اور کا بھی اضافہ ہوا ہے ۔ وہ رشتے میں ان کے بھتیجے ہوتے ہیں ۔ نام ہے ان کا علاؤ الدین مظہر !

یہ صاحب بھی عجیب چیز ہیں۔ حفیظ صاحب سے انھیں اتنا عشق ہے جتنا مجنوں کو لیلیٰ سے تھا۔ یا جتنا فرہاد کو شیریں سے تھا۔ یہ ان کے لیے دُشواریوں کے پہاڑ کاٹ سکتے ہیں۔ یہ ان کے لیے بلا اُجرت ہی "کھیتی باڑی" کر سکتے ہیں۔ تاکہ قربت نہ چھننے!

مظہر صاحب کی ایک کمزوری تو ہیں حفیظ صاحب اور دوسری علّت ہے موسیقی، کلاسیکی موسیقی کے جتنے ریکارڈ ان کے پاس ہیں۔ اتنے شاید ہی کسی کے پاس ہوں۔ مثال کے طور پر سہگل کے ریکارڈوں کا تو ان کے پاس پورا سیٹ ہے۔ بلکہ بعض گانوں کے تو کئی کئی ریکارڈ ہیں۔ سہگل کی ہر سال دھوم دھام سے برسی بھی مناتے ہیں۔ اگر یہ حفیظ صاحب کے بعد زندہ رہے تو انشاءاللہ یہ ان کا بھی عُرس منائیں گے۔ مطلب یہ کہ حفیظ صاحب کے جینے مرنے کے ساتھی ہیں۔ مرنے کے ساتھی ان معنوں میں، اگر انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ میری زندگی کے بدلے میں، حفیظ صاحب کی زندگی کے دن بڑھ سکتے ہیں تو یہ اس سودے پر بھی راضی ہو جائیں گے۔

حفیظ صاحب، ہر وقت، ہمہ اقسام کی دوائیاں کھاتے رہتے ہیں۔ خمیرہ مروارید کھائیں گے کہ دل کو تقویت پہنچے۔ خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا کھائیں گے۔ اعصاب کو تقویت پہنچے۔ لبوب کبیر کھائیں گے کہ اعضائے رئیسہ کو تقویت پہنچے۔ یہ ہمہ وقت، ہمہ پہلوؤں سے فٹ رہنا چاہتے ہیں۔

بعض لوگوں کو اعتراض ہے کہ یہ دوائیاں ہی کھاتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔

اگر یہ دوائیاں نہ کھاتے تو یہ آج سے پہلے مرگئے ہوتے۔ کون سی پریشانی ہے جو انھیں لاحق نہیں۔ شاعر ہیں تو وہ ان کے خلاف، اس لیے کہ ان کے سامنے کم کسی کے چراغ جلتے ہیں۔ رشتہ دار ہیں تو وہ خلاف اس لیے کہ یہ ہر ایک کے لیے امرت دھارا نہیں بن سکتے۔ دوست ہیں تو وہ خلاف، اس لیے کہ مفاد ٹکراتے ہیں۔ تقویت ہے تو انھیں صرف ایک کہ عوام و خواص کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ وہ انھیں سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔ جس دن عوام سے ان کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ اُس دن حفیظ صاحب زندہ نہ رہیں گے۔ ایک پلڑے میں ان کے مصائب ہیں۔ دوسرے پلڑے میں عوام کی تحسین و ستائش!

۳۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو یونیورسٹی کیمپس میں دانشوروں سے خطاب کرنا تھا۔ میں بھی اس جلسے میں موجود تھا۔ گرمیں چاہتا تھا کہ اُس دن کی کارروائی کے تاثرات خود حفیظ صاحب کی زبانی سنوں کیونکہ اس جلسے میں بھٹو صاحب نے انھیں مخاطب کرکے بھی، ان کی شان بڑھائی تھی۔ میں اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ اب یہ کس مقام سے بولتے ہیں۔

"بھٹو صاحب کی اُس دن کی تقریر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بھٹو صاحب مجھ سے ناراض تھے۔"

"وجہ؟"

"وجہ یہ تھی کہ جب بھٹو صاحب الیکشن لڑ رہے تھے تو ان کے مخالف اُمیدوار

ڈاکٹر جاوید اقبال تھے اور میں اُن کا حامی تھا۔ اس لیے کہ وہ ڈاکٹر اقبال کا بیٹا تھا۔
" گو جلسے میں تو انھوں نے آپ کا حال احوال پوچھا اور یہ بھی کہا "آپ نے قومی ترانہ لکھا ہے۔ مگر اب ہمیں انقلابی ترانہ لکھ کر دیں "۔
" جی ہاں! یہ ٹھیک ہے مگر میں تو پہلے سے کہہ رہا ہوں"۔ قوّتِ اخوّتِ عوام"۔
—— اور اس مصرعہ کو بدلوانے کے لیے اس وقت کی حکومت نے مجھ پر بڑا زور ڈالا تھا۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ بھٹو صاحب نے تو اب جا کر کہا انقلابی ترانہ لکھیں اور میں پہلے سے کہہ رہا ہوں "۔ قوّتِ اخوّتِ عوام"۔
وہ جو میں نے ابھی کہا تھا۔ جس دن عوام سے ان کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ اُس دن حفیظ صاحب زندہ نہ رہیں گے۔ کچھ غلط نہ کہا تھا۔ مندرجہ بالا واقعہ بھی اس اَمر کی شہادت دیتا ہے۔ مگر میں پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹا، دریافت کیا "آخر تقریر کے بارے میں کیا تاثر تھا؟"
بھٹو صاحب نے وہ تقریر اس ماحول میں کی تھی کہ جب پبلک قرآن بھی سُننا نہیں چاہ رہی تھی۔ قاری قرآن کی تلاوت کر رہے تھے اور پبلک نوکر شاہی مُردہ باد کے نعرے لگا رہی تھی۔ ایسے میں بھٹو صاحب کا تلملانا جائز تھا۔ کیونکہ وہ ابتلا کے اس دَور میں بھی پبلک کی ناعاقبت اندیشی اور ہٹر بونگ سے آزردہ ہو کر، برہم ہو اُٹھے تھے۔ اگر پبلک کا یہی حال رہا تو مجھے ڈر ہے کہ ؎

یہ ناخُدا ہے اے اہلِ کشتی
شاید کسی روز کر دے کنارا

نقوش کے خطوط نمبر میں، حفیظ صاحب کے کچھ خطوط[1] درج ہیں۔ خطوط کی تعداد ۳۲ ہے اور وہ سب کے سب عزیز ملک کے نام ہیں۔ بے شک یہ خطوط طرزِ انشا کے اعتبار سے خاصے اہم ہیں اور یہ بھی کہ اُن میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے حفیظ صاحب کی زندگی پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان خطوط میں جو چیز زیادہ نمایاں ہے وہ ہے ان کی زندگی کے کربناک پہلو، جن میں بے قراری ہی بے قراری ہے۔ بے اطمینانی ہی بے اطمینانی ہے۔ مایوسی ہی مایوسی ہے۔

یہ مضمون لکھنے سے پہلے یا کچھ جاننے کی کوشش سے پہلے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ حفیظ صاحب ایسے انسان کو، جنھیں ڈھیروں خوشیاں ملی ہوں، جنھیں اُونچی تنخواہیں ملی ہوں، جسے غریب سے لے کر وزیر تک نے چاہا ہو۔ وہ اتنا دُکھی بھی ہو سکتا ہے میں یہ باتیں کوئی سُنی سنائی نہیں کر رہا۔ بلکہ اُن کے خطوط سے نکال کر یہاں ڈھیر کر رہا ہوں۔

ا[2] یہاں سوائے معاندت کے اور کچھ نہیں۔ ابھی مجھے دوزخ میں سے گزرنا ہے اور یہ راہ تنہا ہی طے کرنا ہے۔ جیلانی صاحب سے میرے مقدمے کی بابت بھی پوچھ کر لکھیے۔ (مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۱ء)

۴۔ سعیدہ میری بیٹی جو اس وقت موت اور زندگی کی حالت میں ہے اور جس کی مرگی اور ہسٹیریا کے دَوروں کے سبب ہم سب موت اور زندگی (کے منہ)

---

[1] تیسری جلد صفحہ ۳۴۷ سے ۳۶۸ تک [2] یہ نمبر خطوط کے ہیں جو نقوش میں درج ہیں

میں ہیں۔ اس کو ذرا افاقہ ہو تو میں اس قافلے کو لے کر لاہور پہنچ جاؤں ۔
میرا معاملہ محکمے سے اُلجھ گیا ہے ۔ وہ مجھے تین سال سے پہلے قانوناً جواب
نہیں دے سکتے ۔ اس لیے ٹھن گئی ہے ؎

اُدھر دُنیا ہے اور دُنیا کے بندے
اِدھر میرا خدا ہے اور مَیں ہوں

(مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۵۳ء)

۸ ۔ میرے گھر میں اللہ اللہ ہی ہے ۔ سعیدہ بیمار، فہمیدہ بیمار، اس کا شیر خوار بیمار،
میں بیمار، ہسپتال میں بیوی بیمار، اللہ کریم ہے اور شاہد عادل اور شافئ مطلق۔

(مورخہ ۱۴ اردسمبر ۱۹۵۳ء)

۹ ۔ علالت چاروں طرف علالت، آسمان و زمین علالت سے بھر گئے ہیں، میری ساری
دُنیا مریض و علیل ہے "سینہ تمام داغ داغ، پنبہ کجا کجا نہم"۔ میری بیوی
سرطان کے اثر سے، جو کچھ ہونے والا ہے وہ پیش نظر ہے۔ میری حالت ۔ادی،
میری ذہنیّت ذہنی کو بھی اُجاڑ کیے دے رہی ہے ۔

(مورخہ ۱۵ ارفروری ۱۹۵۴ء)

۱۰ ۔ آج میری ۳۵ برس کی رفیقۂ حیات نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا ۔ آج
سہ پہر ساڑھے تین بجے میری زندگی کی یہ جنگ بھی میری شکست پر فیصل
ہوگئی ؎

جینا پڑے گا اے جانِ شیریں
کرنی پڑے گی تلخی گوارا

مورخہ ۷ رمارچ ۱۹۵۴ء

۱۴۔ گزشتہ دو ماہ سے تقریباً چارپائی پر ہی ہوں اور اس وقت ایسی حالت ہے کہ تم مجھے پہچان نہیں سکتے۔ چل پھر نہیں سکتا لیکن اُمید قائم ہے ؎

ابھی باقی ہے میعادِ مصیبت
ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں

(مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۴ء)

۱۷۔ یہاں ڈاکٹر اعظم کریوی بے رحمی سے قتل کر دیئے گئے۔ کچھ دنوں سے وہ میرے مددِ معاون تھے۔ اب پھر تنہا ہوں۔ اُردو کے مشہور اخبار نویس اور شاعر حسرتؔ بھی اُٹھ گئے ؎

ساقیا یہ رواروی کا ہے دَور
بھر دے بھر دے کچھ اور پیمانہ

مورخہ ۷ رجولائی ۱۹۵۵ء

۲۱۔ گزشتہ ۳۰ ر اپریل ۱۹۷۱ء کو دراصل میں مرچکا تھا۔ میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ۳۰ ر اپریل سے پہلے اگر کوئی تاثر میرے قلب پر اس طرز سلوک کا تھا بھی تو وہ موت نے دُور کر دیا۔ مجھے تو اب ان کانٹوں سے رنج نہیں جن سے

میری رُوح فگار ہے ـــــ ذبح شدہ جانور ارادہ سے حرکت نہیں کیا کرتا۔

(مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۱ء)

۲۶۔ جس اُلجھن میں گرفتار ہوں۔ اگر یہ شیطان ہی کی آنت ہے تو واقعی یہ کوئی ایسی آنت نہیں جس سے چھٹکارے کی صُورت کسی قصاب کی چُھری سے ہو سکے۔ بس اللہ ہی چاہے تو رہائی اور نہ چاہے تو بہر حال یہ آنت سانپ کی طرح مجھے کَس چکی ہے۔ اور یہ ہے میری گھریلو زندگی! (۱۹۶۱ء)

۲۷۔ ننھی چھ برس سے بھی کم عمر کی، ناتواں اور ہڈیوں کا ڈھانچ بچی، کئی کئی مرتبہ عقوبت اور جانکنی میں مبتلا، قے کر کے بیہوش اور ساقط النبض ہو ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر میری طرف سے خط لکھنے میں کوتاہی ہوئی ہے تو یہ کوتاہی ارادتاً نہیں ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں مر نہیں چکا تو قریب المرگ ہوں اور جان کنی کر رہا ہوں۔ میرا دھڑ کہیں ہے۔ سر کہیں ہے۔ بازو کہیں ہے۔ (۱۹۶۲)

غم موجود ہے آنسو بھی ہیں، کھا تو رہا ہوں پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں، اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

ہر شخص اپنے خیالات کی سُندرتا کی وجہ سے سُندر ہوتا ہے۔ دردمند دل رکھنے کی وجہ سے محب ہوتا ہے۔ اسلام سے شیفتگی رکھنے کی وجہ سے مسلمان ہوتا ہے۔ وطن سے محبّت رکھنے کی وجہ سے وطن دوست ہوتا ہے۔ قوم کا خدمت گزار ہونے

کی وجہ سے فائدہ ہوتا ہے ۔

میں نے پہلے بھی کئی دوستوں پر مضامین لکھے ۔ مگر جو تسکین مجھے حفیظ صاحب پر لکھ کر ہو رہی ہے اُس کا عالم ہی کچھ اور ہے ۔ مندرجہ ذیل انکشافات بھی نقوش کے انہی صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں جن کا ذکر آپ پہلے پڑھ آئے ہیں ۔

(۳۱)[1] شمشیر کا معرکہ جہادِ اصغر ہے اور قلم کا معرکہ جہادِ اکبر، میں نے فیصلہ تو وہی پرانا ہی قائم رکھا ہے کہ راولپنڈی کے قریب، مری کی پہاڑیوں میں عقابی گھونسلہ۔

(مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۵۳ء)

(۲) کوئی پریس اب مجھے درکار نہیں ۔ ملّت کو جو صورتِ حال درپیش ہے ۔ میں اپنی بساط بھر اس سلسلے میں اپنا فریضہ ادا کر رہا ہوں ۔ فوج کو مضبوط کرنا اور مضبوط رکھنا یہ عظیم الشان کام، میری اپنی یا اپنے خاندان کی ننھی سی مصیبت، ملّت کے مصائب کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہے ۔ میں اس کام کو انجام دیے رہنے کا تہیہ کیے ہوئے ہوں ۔ جو پاکستان کی بقا کے لیے ضروری ہے ۔ میں ایک قطرہ ایک ذرّہ ناچیز ہوں ۔ لیکن اللہ نے مجھے جو کچھ دیا ہے میں محمدؐ کی امت سے اس کے معاملے میں بے وفائی نہیں کر سکتا ۔ (مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۵۱ء)

(۲۳) میں اب چلا ہوا کارتوس سمجھ لیا گیا تھا اور میں نے بھی گوشۂ تنہائی کو قبول کر لیا تھا ۔ لیکن اگر قوم کو مجھ سے توقعات ہیں تو جب تک میرے ایمان پر ضرب کا

---

[1] بحوالہ خطوط نمبر نقوش

خطرہ نہ ہو میں پاکستان میں اسلام کی ہر تحریک کا ادنیٰ سپاہی بنے رہنے کو گوشہ گیری پر ترجیح دوں گا ؎

میں کیا ہوں اس خیال سے آتا ہے ڈر مجھے
کیوں دیکھتے ہیں غور سے اہلِ نظر مجھے

میرا خیال ہے کہ موڈ کو اب ذرا بدلنا چاہیے۔ کیونکہ زیادہ دیر، پریشانیوں کے ہجوم میں بیٹھا بھی نہیں رہا جا سکتا۔ لہٰذا اب ذرا میٹھی باتیں بھی ہو جائیں۔

حفیظ صاحب جب لندن گئے تو انھوں نے وہاں بیٹھ کے محسوس کیا کہ " اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے!"

رشکِ عدن ہے باغِ وطن ہے
نازک بدن بھی غنچہ دہن بھی
سیلے روش بھی شیریں سخن بھی

اُس حسن میں ہے ہلکا نمک بھی
مے کا نشہ بھی لُطفِ گزک بھی
دل میں وفا بھی درد اور تپک بھی
جو کچھ یہاں ہے سب ہے وہاں بھی
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

جب یہ نظم لندن سے لکھ کر لائے اور اپنے دوستوں میں بیٹھ کر سنائی تو سب بہت محظوظ ہوئے۔ سب جھومتے تھے۔ مصرعے دہراتے تھے۔ نازک بدن بھی، غنچہ دہن بھی، لیلی روش بھی، شیریں سخن بھی، ــ مگر ایک دوست نے سوال کر دیا "حفیظ صاحب جب سب کچھ اپنے وطن میں تھا تو آپ لندن سے ایک عدد بیوی کیوں لے آئے؟"

اس کے جواب میں حفیظ صاحب نے کہا "تجھے نہیں معلوم کہ میں نے ایسا کیوں کیا" اس کے بعد حسب عادت مخاطب کی طرف مسلسل دیکھتے رہے اور مسلسل جاذب مسکراہٹ کے ساتھ ہنستے رہے۔ پھر اُسی عالم میں اپنے خاص انداز میں کہا "تجھے نہیں معلوم!"

ایک دن سُنا کہ اس انگریز بیوی کو اُنھوں نے چھوڑ دیا۔ یا یہ کہ وہ انھیں چھوڑ کر واپس لندن چلی گئی ہے۔ یہ ان کا خالص گھریلو معاملہ ہے۔ اس سلسلے میں اس میں دخل کیوں دوں؟ چاہوں تو معلومات حاصل کر سکتا ہوں۔ کچھ کچھ معلوم بھی ہے۔ مگر انھیں ضبطِ تحریر میں لانے کا فائدہ؟

ابھی حفیظ صاحب کی بیگمات کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک دن اچانک سُنا کہ حفیظ صاحب نے ایک ریڈیو آرٹسٹ (خورشید جہاں) سے شادی کر لی۔ اس وقت فوراً ذہن میں حفیظ صاحب ہی کی نظم آئی۔ "ابھی تو میں جوان ہوں"۔ حالانکہ شادی کے وقت ان کی عمر ۵۵ اور ۶۰ سال کے درمیان ہوگی۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا۔ ابھی تو میں جوان ہوں!

یہ کیا گماں ہے بدگماں — سمجھ نہ مجھ کو ناتواں
خیالِ زہد ابھی کہاں — ابھی تو میں جوان ہوں

اپنی جوانی کا یقین دلانے کے لیے کہتے ہیں کہ

نگار ہائے فتنہ گر اُبھارتے ہوں عیش پر
تو کیا کرے کوئی بشر ابھی تو میں جوان ہوں

جو کچھ کہا۔ سچ کہا۔ واقعی اگر نگار ہائے فتنہ عیش پر اُبھارتے ہوں تو بشر کیا کرے؛ پھر جب ساٹھ سال کی عمر میں بھی :

ہے موت اس قدر قریں مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں نہیں، ابھی نہیں ابھی تو میں جوان ہوں

تو پھر نہ حفیظ صاحب سے کوئی شکوہ ہوتا ہے اور نہ کسی اور سے بلکہ ذہن میں جو کچھ آتا ہے وہ یہ کہ انھوں نے عین اسلامی کام کر ڈالا۔ کیونکہ یہ شاہنامہ اسلام کے بھی تو مصنّف ہیں ؎

سلام اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

حفیظ صاحب جن لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے تھے ۔ وہ بڑی اہمیّت کے لوگ تھے ۔
شاعروں میں گرامی، اقبال، ظفر علی خان، دوستوں اور کرمفرماؤں میں سر عبدالقادر، سر راس مسوؑد
حکیم اجمل خاں ۔ رہنماؤں میں قائداعظم، محمّد علی جوہر، جواہر لعل نہرو، ان سب کی موجودگی
میں انھوں نے سوچا کہ مجھے بھی کوئی ایسا کام کرنا چاہیے ۔ جس سے میری بھی اہمیّت
بڑھے اور مجھے بھلایا نہ جاسکے اور دیگر دوستوں کی طرح میں بھی زندہ رہوں ۔

سوچ بچار کے بعد انھوں نے شاہنامہ اسلام کا ڈول ڈالا ۔ اس کوشش کو
چاہے کوئی شاعری میں اُونچا درجہ نہ دے مگر یہ کام زندہ ضرور رہے گا ۔ مستقبل پر کمندیں
ڈالنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا ۔ اس کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی عظیم ذہن کارفرما
ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میں انھیں شاعروں میں شاعر نہیں بلکہ شاعروں میں پیغمبر
سمجھتا ہوں ۔

اس دور میں، اگر کوئی یہ کہے کہ چند ایسی نظموں کے نام لیجیے کہ جنہیں قبولیت خواص و عوام حاصل ہوئی ہو تو اُن میں مولانا حالی کی مسدس، اقبال کا شکوہ اور حفیظ کا شاہنامہ (اختصار مطلوب ہو تو سلام) ہی ذہن میں آئیں گی۔ ان کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسے اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ شاہنامہ اسلام کو منظوم کتاب کم، مقدس کتاب زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہ ہوگی جو صبح قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوں اور رات کو شاہنامہ اسلام پڑھتے ہوں۔ مسجدوں میں یہ پڑھا جائے۔ مولودوں میں یہ پڑھا جائے۔ شہروں میں یہ پڑھا جائے، دیہاتوں میں یہ پڑھا جائے۔ یہ واقعہ ہے کہ اُردو میں اس سے زیادہ مقبول کسی اور شاعر کا کلام نہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بعض لوگ شاہنامہ اسلام کو، ادب میں کوئی جگہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ مگر میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ یہ کوئی معمولی کام ہے۔ یا یہ کہ اسے ہر کوئی انجام دے سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی نہ کوئی کر کے دکھا بھی دیتا۔ کیونکہ اس کام سے دین بھی بنتا ہے دنیا بھی، پھر کوئی کیوں پیچھے رہتا؟

قیام پاکستان سے پہلے جب میں بچہ تھا۔ بچہ نہیں تھا تو اُسے میرے لڑکپن اور نوجوانی کا زمانہ کہہ لیجیے۔ اُن دنوں تیس روزے رکھتا تھا۔ پانچ نمازیں پڑھتا تھا۔ اُن دنوں سُنا کہ شاہنامہ اسلام کی ٹکر کی ایک کتاب چھپ رہی ہے۔

کنسوئی لی تو معلوم ہوا کہ ایک ملّی شاعر فضل دین فضل کی کتاب "معجزات رسولؐ" چھپ رہی ہے۔ وہی بحر، وہی قافیہ، وہی ردیف، وہی واقعات، فضل دین صاحب نے

ایک دو بڑی مسجدوں میں بھی اس کے کچھ حصّے پڑھے۔ ذکرِ خدا ہو یا ذکرِ رسولؐ، وہاں تو مُسلمان سر دُھنیں گے ہی، تھوڑی بہت واہ واہ ضرور ہوئی مگر اس میں مولوی مدن والی بات نہ تھی۔

فضل دین صاحب پڑھتے بھی اچھا تھے، حفیظ صاحب ہی کی طرز پر، گا تو شاید انھوں نے ویسا لیا مگر حفیظ صاحب کے شعروں میں جیسی دلسوزی تھی، جیسی تڑپ تھی۔ یا جیسا موضوع سے عشق نظر آتا تھا۔ وہ اُسے کہاں سے لاتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اُس کتاب کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ ویسے حفیظ صاحب کے مخالفین کا پراپیگنڈہ یہ تھا کہ اِدھر یہ کتاب آئی اُدھر شاہنامہ ٹھپ ہوا۔

اسی طرح کی ایک اور کوشش منظور احمد نے بھی کی تھی۔ کارنامۂ اسلام کے نام سے کتاب چھپی۔ وہ کتاب بھی شاہنامہ اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ ایسی کوشش اپنی جگہ مستحسن سہی، مگر اُس بھاری پتّھر کو کوئی بھی تو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

میں نے ایک دن حفیظ صاحب سے استفسار کر ڈالا "شاہنامہ لکھنے کا خیال کیسے آیا؟"

"یہ نہ پوچھو"

"کوئی خطرناک بات ہے؟"

"رُسوائی کا ڈر ہے"

"پھر ضرور بتائیے، اس دَور میں عزّت کسے ملی ہے جو آپ کو رُسوائی کا ڈر ہے"

"سنو! ـــــ جو انسان سوچتا ہے۔ وہی ذہن پر مسلّط رہتا ہے۔ خواب بھی

ویسے آتے ہیں۔ ایک بار مجھے خواب آیا۔ یہ قصّہ ۱۹۲۶ء کا ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ اندھیرا ہے چلا جا رہا ہوں۔ دو طرفہ درخت ہیں۔ میں پیدل ہوں اور تنہا، آگے جا کر ایک عمارت آجاتی ہے۔ پرانی اور شکستہ مسجد معلوم ہوتی ہے۔ دیواریں کائی زدہ، ایک لخت محسوس ہوا۔ منزل آگئی ہے۔ دروازے میں داخل ہوا۔ ایک بزرگ نظر آئے۔ چھوٹا قد گٹھا ہوا جسم، ذہن میں حضرت علیؓ!

میں جُھک جاتا ہوں۔ فرمایا "آگئے؟" کچھ کہے بغیر میں وضو کرنے لگا۔ فرمایا "چلے آؤ۔ انتظار ہو رہا ہے۔ مسجد کے صحن اور برآمدے سے گزر کر محراب کی طرف بڑھتا ہوں۔ دیکھا منبر کی طرف منہ کر کے سرکارؐ بیٹھے ہیں۔ ان کے برابر سر پہ سفید چادر ڈالے ابوبکر صدیقؓ بیٹھے ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا "ابو تراب آگئے؟"

میرے ماں باپ قربان آگئے!

میں نے دیکھا حضورؐ مسکرا رہے ہیں۔ میں رو رہا ہوں۔ زار و زار، اب انھیں لے جائیں۔ یہ انصاف کریں گے۔ انھیں عَلَم دو۔ اب مولا علیؓ مجھے رخصت کرتے ہیں۔ معاً نیند کُھل گئی۔ اذان ہو رہی تھی۔ تکیہ بھیگا ہوا تھا۔ مجھ پہ کپکپی طاری تھی۔

میں نے کہا "عجیب خواب تھا۔"

"تم اسے میری ضعیف الاعتقادی کہو یا کچھ اور، میں تو اسے بشارت ہی سمجھا۔

چنانچہ میں نے کچھ سوچ کر اُسی دن نشاہنامہ اسلام کی داغ بیل ڈالی —"

بظاہر ہیں جو تصویر سخن میں رنگ بھرتا ہوں
کسی آواز کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں

جب پہلے پہل شاہنامہ اسلام کو لے کر حفیظ صاحب حیدرآباد دکن گئے تو ان کی خوب مخالفت ہوئی۔ امجد حیدرآبادی ایسا شریف النفس انسان بھی کہہ رہا تھا:

ادبار بصورتِ دبیر آیا ہے
اِک شاعرِ تاریک ضمیر آیا ہے
شہنامۂ اسلام کا کشکول لیے
پنجاب کا مشہور فقیر آیا ہے

جوش ملیح آبادی اور حفیظ کی چشمکیں تو سامنے کی باتیں ہیں۔ وہ بھی کیوں چُپ رہتے۔

تجھ کو نہیں معلوم تعمّق کیا ہے؟
آخر یہ ترا طرزِ تملق کیا ہے؟
اسلام کا شاہنامہ لکھنے والے!
اسلام کو شاہی سے تعلق کیا ہے؟

اور پھر یہ بھی چُپ کیوں رہتے؟ ان کے خلاف جو شاعروں کی برادری کا محاذ تھا۔ اس کے چھکّے اگر کسی نے چھڑائے تو وہ حفیظ ہی ہے۔ یہ اکیلے، اُدھر ٹولیوں کی ٹولیاں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اگر حفیظ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کدورتوں کے سیلاب میں کب کا ڈوب چکا ہوتا۔ نہ جانے ان کے اعصاب میں وہ کون سی فالتو چیز لگی ہے۔ جو

اوروں کے ہاں نہیں ہوتی۔

ترجمان القرآن، جو ابوالکلام آزاد کی تفسیر ہے۔ اس کا انتساب یوں ہے:-

" غالباً ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشا کی نماز سے فارغ ہوکر مسجد سے نکلا تو مجھے احساس ہوا۔ کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مُڑ کر دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔

" آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

" ہاں جناب! میں بہت دُور سے آیا ہوں۔"

" کہاں سے؟"

" سرحد پار سے!"

" یہاں کب پہنچے؟"

" آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے۔ انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔"

" افسوس! تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"

" اس لیے کہ آپ سے قرآنِ مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت

اس لیے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا۔ میں اُسے واپسی کے لیے روپیہ دُوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر پڑے۔ اُس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصّہ پیدل طے کیا ہو گا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں لیکن اگر میرے حافظہ نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے معنون کرتا۔"

ابوالکلام

کچھ ایسا ہی واقعہ حفیظ صاحب کا بھی ہے۔ ایک سفید ریش، ان کی کوٹھی پر آئے۔ انھوں نے آکر ان کے ایک عزیز سے کہا۔ میں حفیظ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھیں اطلاع ہوئی تو باہر آئے اور اس بزرگ سے مخاطب ہو کر کہا "فرمائیے؟

"میں حفیظ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں"

"فرمائیے کیا حکم ہے؟"

بزرگِ سفید ریش نے انھیں حفیظ جالندھری نہ سمجھتے ہوئے پھر کہا۔" میں حفیظ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں"

"میں ہی ہوں!"

"نہیں، نہیں!"

حفیظ صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ بزرگ کسی ایسی ہستی کو حفیظ جالندھری کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو ان کے خیالوں میں بسا ہوا تھا۔ ایک نورانی ہیولا،

یہ جب انھیں عام سے آدمی لگے تو انھوں نے انھیں حفیظ ماننے سے انکار کر دیا۔ کچھ ایسی ہی تذبذب کی کیفیت کا اندازہ کر کے، کچھ بزرگ کی انتہا محبت کا خیال کر کے حفیظ صاحب رو پڑے۔ بزرگ کے قدموں پہ گر پڑے۔

" بابا جی آپ ملنے آئے ہیں۔ وہ بندۂ ناچیز میں ہی ہوں"۔

تعارف کی یہ رسم عجیب تھی۔ وہ ان کے گلے سے مل کر روتے رہے۔ یہ اُن کے گلے سے مل کر روتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے آپ کو سنبھال کر حفیظ صاحب نے کہا" بزرگوار آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

" پشاور سے!"

" کیسے آئے؟"

" پیدل!" (سوال کچھ تھا۔ جواب کچھ)

" پیدل کیوں؟"

" وہ اس خیال سے کہ آپ کی خدمت میں یوں حاضر ہونا، میری نجات کا باعث بن جائے گا"

" نجات کا باعث؟"

" جی ہاں! میں تو صرف آپ کی زبان مبارک سے شاہنامہ سُننے آیا ہوں"۔

" جب یہ شاہنامہ سُنا رہے تھے تو اُن پہ عجب جذب وکیف کا عالم تھا۔ کبھی کبھی تڑپ کر اللہ اکبر کا نعرہ بھی بلند کرتے۔ جب یہ پڑھ چکے تو وہ بزرگ اُٹھے

اور چل دیے۔ انھوں نے ان سے التجا کی ذرا تو رُکیے !"

" اب نہیں !"

" کیوں ؟"

" میری تمنا پوری ہو گئی "۔

ان کے بھتیجے علاء الدین مظہر نے بتایا کہ میرا جالندھر میں ہوٹل تھا، چونکہ میرے والد ملٹری کے ٹھیکیدار تھے۔ اس لیے ان کا اُٹھنا بیٹھنا فوجی افسران کے ساتھ بھی تھا۔ ایک دن یہ اپنے ہوٹل پر بیٹھے "سوز و ساز" پڑھ رہے تھے کہ ان کے دوست ایک فوجی افسر نے کہا " اس کتاب کو پھینک دیجیے "۔

" کیوں ؟"

یہ اُس زمانے کی بات ہے کہ جب ہٹلر کی فوجیں دُنیا کو تہس نہس کر رہی تھیں۔ اور اس فوجی افسر کو یہ معلوم نہ تھا کہ حفیظ اس برخوردار کے چچا ہیں۔ چنانچہ " کیوں " کے جواب میں فوجی افسر نے کہا " اس لیے کہ حفیظ نے انگریزوں کی نوکری کرلی ہے "۔

فوجی افسر کا اشارہ، ان کے سونگ پبلسٹی آرگنائزیشن میں ڈائرکٹر ہونے کی طرف تھا۔ علاء الدین نے فوجی وردی کی طرف اشارہ کر کے کہا " آپ بھی تو انگریز کے ملازم ہیں "۔

" بے شک ہوں "

" پھر اعتراض کیوں ؟"

" اعتراض اس لیے کہ مجھ ایسے تو اس قوم میں ہزاروں ہیں۔ لاکھوں ہیں مگر ہم میں حفیظ جالندھری ایک ہی ہے ۔ ہماری زندگی سانس کی آمد و رفت تک ہے حفیظ کی زندگی تو دائمی تھی ۔ میں مر جاؤں گا تو کسی کو یاد بھی نہ آؤں گا۔ حفیظ صاحب تو امر تھے ۔ پھر یہ کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پہ کیوں لگا لیا؟ کیوں لگالیا؟"

اس کا جواب حفیظ صاحب کے بھتیجے کے پاس نہ تھا کسی کے بھی پاس نہ تھا۔ سوائے اس بے تکے جواب کے، کہ اُس وقت انگریز کا ساتھ دینا، خود اپنی آزادی کے لیے ضروری تھا۔

حفیظ صاحب اسلام اسلام بہ طور تکیہ کلام کے نہیں پکارتے رہتے بلکہ ان کی رگ رگ میں اسلام رچا ہوا ہے ۔ اسلام سے تمسخر یا زیادتی کو جھیل جانا، ان کے بس کی بات نہیں۔ انھوں نے ہمیشہ دوسرے مذاہب کا بھی احترام کیا ہے ، جس کی متعدد مثالیں ان کے کلام سے ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔ خاص طور پر ہندو مذہب سے ان کا لگاؤ جذباتی سہی، مگر وہ ہے۔ جو اپنی رنگا رنگی کے اعتبار سے ایسا ہے جس کی مثال اُردو شاعری میں شاذ ہی ملے گی مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائے اور چین کی بنسری بجائے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کا ایک واقعہ ہے :

ماڈل ٹاؤن میں جہاں کہ یہ رہتے ہیں۔ کونے پر ایک مسجد ہے۔ مگر کبھی یہ مسجد غیر مسلم کارندوں کی زد میں آ گئی تھی۔ دھڑا دھڑ گرائی جا رہی تھی اور وہ وقت صبح کاذب

کا تھا کسی نے آکر حفیظ صاحب کو اطلاع دی کہ مسجد گرائی جارہی ہے اور ماڈل ٹاؤن کی ہندو اکثریت کھڑی خندۂ استہزا فرما رہی ہے ۔

یہ ابھی سو کے اُٹھے ہی تھے ۔ صرف پاجامہ اور بنیان پہنے ہوئے تھے۔ یہاں سی حالت میں ننگے پاؤں، اپنی بندوق اُٹھا کے لپکے ۔ وہاں پہنچ کے دھاڑے "خبردار جو اب کسی نے گینتی چلائی ۔ خدا کی قسم میں مسجد کو مسمار کرنے والوں کو زندہ نہ چھوڑوں گا" یہ سننا تھا کہ کارندے پیچھے ہٹ گئے ۔ تماشائی کھسک گئے ۔

پہلے اساتذہ اپنے شاگردوں پہ فخر کیا کرتے تھے ۔ بہ لحاظ معیار اور بہ لحاظ تعداد ایک اُستاد کہتا تھا ۔ میرے اتنے شاگرد ہیں ۔ دوسرا اُستاد کہتا ۔ میرے اتنے شاگرد ہیں ۔ پھر مشاعروں میں ٹولیوں کی ٹولیاں پہنچتی تھیں ۔ اپنی اپنی صف کے شاعروں کو "اٹھایا" جاتا تھا ۔ داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے تھے ۔ مخالف گروہ کے شاعروں کو "گرایا" جاتا تھا ۔ آوازے کسے جاتے تھے ۔

میر کے کئی شاگرد تھے ۔ جن میں کئی نامور ہوئے ۔ غالب کے بہت سے شاگرد تھے ۔ جو نہ صرف اپنے وقت میں پوجے جاتے تھے بلکہ آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ دُور کیوں جائیں ابھی ماضی قریب میں داغ کے بے شمار شاگرد تھے ۔ جلیل اور امیر کے بھی بہت سے شاگرد تھے مگر اپنے حفیظ صاحب کا کوئی شاگرد نہیں ۔ اگر کوئی ہوگا تو خفیہ ہوگا ۔ الم نشرح نہیں ۔ تک بند ہوگا ۔ شاعر نہ ہوگا ۔ آخر کیوں ؟"

کیوں کا جواب ایک نہیں ۔ کئی ہوں گے معقول بھی اور بے معنی بھی، ہمیں اس سے کیا ۔ حفیظ صاحب سے پوچھیں گے تو وہ اپنی ادائے خاص سے یہ فرما دیں گے

"برخوردار میں تو ابھی خود شاگرد ہوں۔ اساتذہ کا خوشہ چیں، لہٰذا میرے شاگرد ہوں
اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس ضمن میں عبدالمجید بھٹی نے اپنے اکلوتے ناول "لغزش" میں ایک اشارہ
کیا ہے۔ وہ پڑھ لیجیے۔ پھر کوئی رائے قائم کیجیے گا۔ وہ کچھ یوں ہے:

"میرا کوئی اُستاد نہیں لیکن اگر میں نے کچھ حاصل کیا ہے تو وہ دو ہستیاں
ہیں حفیظ جالندھری اور نشتر جالندھری، اگر انھیں پتہ چل جاتا کہ میں اُن
سے کچھ حاصل کر رہا ہوں تو یہ مجھے پاس بھی پھٹکنے نہ دیتے۔"

یہ کبھی نہیں رذّاتی والا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے میری عافیت اسی میں
ہے کہ ذرا دم لوں اور آگے چلوں۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں یہ مضمون ایک انسان کے
بارے میں لکھ رہا ہوں کسی خدا کے بارے میں نہیں۔

مشاعروں میں، یہ فقرے بازی بھی خوب کرتے ہیں۔ انھیں شعر پڑھ کر اِتنا
لُطف نہیں آتا۔ جتنا کہ فقرہ لڑھکا کر، یہ تقریباً ہر مشاعرے میں اپنی ایسی ہی بوالعجبیوں
کا ثبوت دیا کرتے ہیں۔ یوں ان کی حاضر جوابی کا بھی ثبوت مل جاتا ہے اور ان کی
ذہانت کا بھی، ایک مشاعرے کے دوران یوں ہُوا مگر یوں ہونے سے پہلے اگر آپ
یہ سن لیں تو اچھا ہو کہ یہ ذکر اُن دنوں کا ہے کہ جب راجہ غضنفر علی خاں ہندوستان
میں پاکستان کے سفیر تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ حریف ملکوں کو بھی ایک دوسرے
کے قریب ہی کر دیا جائے۔ چنانچہ اور صورتوں کے ساتھ انھوں نے ایک صورت یہ

بھی پیدا کی کہ لاہور میں پاک و ہند کے درمیان کرکٹ کا ایک عدد میچ کرا دیا تھا۔ اسی موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہُوا۔ ایک سردار جی نے ترنگ میں آکر کہہ دیا تھا ؎

تُو چت نہ چت بھاویں

چت لیا ای سجنا دل میرا

اُسی مشاعرے میں حفیظ صاحب نغمہ سرا ہوئے ؎

جوانی کے ترانے گا رہا ہوں

دبی چنگاریاں سُلگا رہا ہوں

ایک آواز، نئی نئی ہوشادی کی ہے۔

حفیظ صاحب کا فی البدیہہ جواب، (آواز کی سمت رُخ کر کے اور ذرا مُسکا کے) میں بیوی سے اتنا نہیں گھبراتا۔ جتنا کہ بیوی کے رشتہ داروں سے گھبراتا ہوں۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا ؎

جوانی کے ترانے گا رہا ہوں

دبی چنگاریاں سُلگا رہا ہوں

پھر ہندوؤں اور سکھوں کی طرف اشارہ کر کے، دوبارہ اشارہ کر کے سہ بارہ اشارہ کر کے یہ شعر پڑھا ؎

تمھوں کو قول دیتا ہوں وفا کا

قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں

آوازیں! بے شک، بے شک!

حفیظ صاحب کا جواب صرف مسکراہٹ تھا، جتنی دیر شعر پڑھنے میں لگائی تھی۔ اس سے زیادہ دیر تک مسکراتے رہے۔ اتنا جاندار قسم کا مسکرائے کہ لوگوں کو شک ہوگیا کہ اب صرف مسکراہٹ پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ ابھی مسکراہٹ جاری تھی کہ دفعتاً سنجیدہ ہوکر یہ شعر پڑھ ڈالا سے

خُدا لگتی کہو بُت خانے والو
تمھارے ساتھ میں کیسا رہا ہوں

یہ شعر پڑھ کر حفیظ صاحب نے ایک سردار جی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ کیوں سردار جی! تمھارے ساتھ میں کیسا رہا ہوں۔

آخری شعر یوں پڑھا کہ پورے مجمع کو، اپنی انگشتِ شہادت کے ذریعہ اشارہ ایسے کیا کہ پہلے تو اپنی انگلی کو ایک سرے سے دوسرے تک لے گئے۔ پھر اپنی اسی انگلی کو دُوسرے سرے سے پہلے سرے تک لے آئے۔ ذرا سا مسکرائے مُسکرانے کے بعد پُورے زور سے کہا۔ سُنیے:

حفیظ اپنے پرائے بن رہے ہیں
کہ میں دل کو زباں پر لا رہا ہوں

ایک آواز ——— "سچ ہے"

حفیظ صاحب کا جواب ——— نہیں، نہیں" سے

بتوں کو قول دیتا ہوں وفا کا
قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں

میں نے ایک دن پوچھا "اِن دنوں کچھ کہا؟ کوئی غزل، کوئی نظم؟"

"اِن دنوں نثر لکھ رہا ہوں۔"

"ماشاءاللہ!"

"ماشاءاللہ تو آپ نے ایسے کہا" جیسے پہلے میں نے نثر نہ لکھی ہو۔"

"پہلی نثر تو میرے سامنے ہے۔ مگر اِن دنوں کیا لکھ رہے ہیں؟"

"چیونٹی نامہ!"

"چیونٹی نامہ؟"

"ہاں ہاں چیونٹی نامہ! (ذہن ایک دم شاہنامہ سے چیونٹی نامہ کی طرف منتقل ہوا)۔ چیونٹیوں کی دُنیا بھی عجیب دُنیا ہے۔"

"اس موضوع میں کیا رکھا ہے؟"

"تمھیں کیا معلوم؟ ـــ چیونٹیاں بھی ہماری اور تمھاری طرح عشق کرتی ہیں۔"

"آپ کی طرح کرتی ہوں گی۔ کیونکہ ابھی میں نے عشق کا باب نہیں کھولا۔"

"چلو میری طرح سہی، پھر یہ شراب پیتی ہیں۔"

"شراب؟"

"ہاں ہاں! ایک خاص طرح کی رطوبت ہوتی ہے، اُسے پیتی ہیں اور مست

ہو جاتی ہیں - پھر یہ ہماری طرح اپنے اپنے گروہ بناتی ہیں اور ایک دُوسری کا خوُن بہاتی ہیں "

" سچ ؟ "

" ہاں ہاں، کتاب چھپے گی تو پڑھ لینا ۔"

" میں ضرور پڑھوں گا - کیوں کہ میں انھیں عشق بازی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں "

۵

یہ واقعہ مجھے حفیظ صاحب نے خود سنایا تھا۔ میں نے کہا "جب یہ بات تھی اور انگریز سے آپ کو اتنی نفرت تھی تو پھر جنگ کے دنوں میں، حکومت کا ایک اہم پُرزہ کیوں بن گئے تھے؟"

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کا اعتراض مجھ پہ ترقی پسند ادیب بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن دنوں فوج میں باری علیگ، چراغ حسن حسرت اور فیض احمد فیض بھی بطور معاون شریک تھے۔"

"یہ تو کوئی جواز نہیں!"

"جواز ہے۔ وہ یہ کہ انگریز کہہ رہا تھا۔ جنگ میں ہماری مدد کیجیے۔ جنگ کے بعد، ہم ہندوستان کو آزاد کر دیں گے۔ یہ جواز ہے۔"

"غرض آپ نے کسی نہ کسی طور، انگریز سے سمجھوتہ کیا تو!"

"ایک اور بات بھی تھی - جو ہر بات سے زیادہ اہم تھی - وہ یہ تھی کہ ایک طرف سے روس بڑھ رہا تھا - دوسری طرف سے جاپان، جاپان تو ہندوستان کے دروازے تک آ پہنچا تھا - گاندھی کی ان سے ساز باز تھی - سبھاش چندر بوس وہاں جاکے بیٹھا ہوا تھا - ان کا آپس میں طے یہ تھا کہ اُدھر سے جاپان دباؤ ڈالے گا - ملک کے اندر کانگریسی بغاوت کریں گے - وہ تو اللہ کا شکر کہ اُن کی اسکیم دھری رہ گئی - اگر کامیاب ہو جاتی تو مسلمانوں کا ایسا قتل عام ہوتا - جیسا کہ غدر میں ہُوا تھا اور تو اور میں نے انگریز عورت سے شادی بھی، انتقام لینے کی خاطر کی تھی -

مسٹر ہیلی پنجاب کے گورنر رہ چکے تھے - حفیظ صاحب سے ان کی ملاقات سر فیروز خان نون نے لاہور میں کرائی تھی - پروگرام کے مطابق، فیروز خان نون نے حفیظ صاحب کو بلایا - چنانچہ گورنر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے -

راستہ میں فیروز خاں نون نے بتایا کہ گورنر صاحب نے آپ کو بہ طور خاص بُلایا ہے کانگریس کا بڑا زور ہے - انگریز پریشان ہے - مجھے اس نے خان بہادر کے "ٹائٹل سے بھی نواز رکھا ہے - اس لیے گورنر صاحب کے حکم کی تعمیل لازمی ہو گی - ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ گورنر ہاؤس آگیا - باریابی ہُوئی -

گورنر جو اچھی خاصی اُردو اور فارسی جانتے تھے - اُنھوں نے کہا "حفیظ صاحب آپ کبھی بھی ہمارے پاس نہیں آئے ؟"

"کبھی کوئی کام نہیں پڑا ؟"

" کام سے تو سب آتے ہیں ۔ دوست بن کر آیا کیجیے "

" میری آپ سے دوستی کیسے ہوسکتی ہے ۔ آپ حاکم، میں رعایا میں سے ! "

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد، گورنر صاحب نے اپنا مدّعا بیان کیا ۔ ہم چاہتے ہیں کہ " آپ کانگریس کے خلاف نظمیں لکھیں تاکہ ان کے شور کو، آپ کی آواز کے بل بوتے پر کم کیا جائے "

" جی ! یہ مشکل کام ہے ۔ جو مجھ سے نہ ہوسکے گا ۔ میں اپنی مرضی سے کچھ لکھوں تو لکھوں، کسی کے کہنے پر نہ لکھ سکوں گا "

" کانگریس انگریز کے بھی خلاف ہے مسلمانوں کے بھی خلاف ہے "

" مگر انگریز ہم دونوں کا دشمن ہے "

حفیظ صاحب کا فرمانا یہ بھی ہے کہ جہاں تک انگریز سے نفرت کا تعلق ہے وہ تو لڑکپن سے ہے ۔ میری عمر انیس برس کی تھی ۔ جلیانوالہ باغ کی فائرنگ سے کچھ دن پہلے امرتسر میں، کانگریس کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ ہوا تھا ۔ اس میں میں نے ایک نظم پڑھی تھی ۔ اور ــــ اس اور سے پہلے ـــــ میں کچھ اور عرض کرنا چاہتا ہوں میرے والد کے ڈاکٹر کچلو سے بڑے تعلقات تھے ۔ کچلو جالندھر آئے تو انھوں نے والد صاحب سے کہا ۔ سُنا ہے تیرا بیٹا بھی شاعر ہے اور اچھے شعر کہتا ہے "

والد صاحب نے کہا " اس نے کیا شعر کہنا ہیں ۔ اِدھر اُدھر سے لکھوا لیتا ہوگا ۔ مگر سُنا تو میں نے بھی ایسا ہی ہے کہ وہ مشاعروں میں پڑھتا ہے اور اچھے شعر کہتا ہے "

" اُسے ذرا بلائیے "

میں حاضر ہوا تو کپھوتے مجھے پاس بٹھا کے کہا " برخوردار شاعری ایسی کرو جو وطن کے کام آئے ۔ ہجر و وصال کے قصّے دہرانے کا یہ وقت نہیں "

" بہت اچھا ! "

" پھر یہ امتحان کب دوگے ؟ "

" جب آپ امتحان لیں گے ؟ "

" تین دن بعد امرتسر میں ایک جلسہ ہو رہا ہے ۔ اس کے لیے ایک نظم لکھو جس میں بیداریٔ وطن کے لیے تڑپ ہو ۔ انگریز سے نفرت کا اظہار ہو اور وہ نظم ہر ایک کے سینے میں آگ لگا دے ۔ کیونکہ اب ہندوستان میں انگریزوں کے دن پورے ہوگئے ہیں ۔ اس لیے تم بھی اپنا حصّہ ڈالو "

چنانچہ میں نے نظم لکھی اور پڑھی ۔ کوئی رام جی داس ، ہل اونر تھے ۔ ان کی صدارت میں اور اُن کے ہی سینما ہال میں وہ نظم پڑھی گئی ۔ نظم بڑی تیز اور جذباتی تھی ۔ خوب بندے ماترم کے نعرے لگے ۔ خوب واہ واہ ہوئی ۔ میری نظم کے بعد کپھو نے تقریر نہ کی ۔ کچھ تو وہ دن رات کام کرنے کی وجہ سے تھکے ہوئے تھے ۔ کچھ انہیں میری حوصلہ افزائی مطلوب تھی ۔ اس لیے وہ یہ کہہ کر بیٹھ گئے " حفیظ نے جو کچھ کہا ہے اور جس جذبے سے کہا ۔ اس کے بعد مجھے کچھ نہیں کہنا ۔ میرے بعد صاحب صدر نے تقریر کی اور اس کی پاداش میں مجھے اور رام جی داس کو گرفتار کر لیا گیا ۔

ایک دن مجھے، بہ ظاہر بڑے معتبر آدمی نے کہا کہ حفیظ صاحب کو، میں نے ایک دن بے حد مخمور حالت میں پایا تھا۔ اتنا مخمور کہ وہ کرسی پر بیٹھتے ہی گر پڑے۔ میں نے وضاحت چاہی۔" وہ ایسے ہی گر پڑے ہوں گے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ وہ شراب نہیں پیتے۔"

انھوں نے بڑے تیقن سے کہا" ابھی پیتے کیوں نہیں۔ میں تنا ہد حاضر ہوں"۔ مجھے وقتی طور پر ان کی بات کا یقین کر لینا پڑا۔ کیونکہ وہ شکل صورت کے اعتبار سے مومن لگتے تھے۔

بہر حال میں کھوج میں تھا۔ مجھے ایک کتاب ملی" فلمی مُہرے"۔ اس میں مشہور ایکٹرس جدن بائی کے گھر کی ایک محفل کا ذکر ہے۔

ذرا یہ دھیان رہے کہ یہ محفل جدن بائی کے گھر پر برپا ہے۔ کیا کیا نہ سامان بہکنے کے ہوں گے۔ کیا کیا نہ ہوش رُبا صورتیں ہوں گی۔ جدن بائی کی بیٹی، خود نرگس ہی کیا کم ہو گی۔ اس پہ طرّہ پوری فلم انڈسٹری کی چیدہ ہستیوں کا، دیکھنے والے کہتے ہیں وہ محفل نہ تھی۔ ایک پری خانہ تھا۔ ہاں تو کتاب مذکور میں، ان کی" بادہ نوشی" کا ذکر کچھ یوں ہے:

فلمی رائٹر دیوان شرما اس محفل میں ذرا سا بہک گئے تھے۔ مگر لوگوں نے انھیں سنبھال لیا۔ جدن بائی نے منہ بنا کر کہا" یہ اتنی پی کیوں لیتے ہیں۔ جو بہک جاتے ہیں۔ اصل میں شراب انہی جیسوں کے لیے حرام کی گئی ہے۔"

وہیں پر حفیظ صاحب اور جوش صاحب میں بھی تھوڑی سی جھڑپ ہوگئی۔ جوش صاحب نشے میں ڈوب چکے تھے اور حفیظ صاحب نے شراب چھوئی تک نہ تھی اس لیے بات بن گئی۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے جب اس محفل میں بھی شراب کو نہیں چھوا تو کسی بھی محفل میں پیتے نہ ہوں گے۔ چوری چھپے کی بات اور ہے۔ کیونکہ خدا کا اور ان کا معاملہ واحد ہے۔

کراچی میں کوئی میوزک کانفرنس تھی۔ حفیظ صاحب صدر تھے۔ میں نے ان سے پوچھا "جناب آپ کا موسیقی سے کیا واسطہ؟"

"جو واسطہ شاعری سے ہے۔"

"کیا آپ موسیقی کی باریکیوں سے بھی واقف ہیں؟ یا اتنے ہی واقف ہیں جس حد تک کہ ہم آپکے گلے سے واقف ہیں۔"

"موسیقی کے کسی جگت اُستاد کو میرے سامنے لاؤ۔ پھر میں تم سے اس مسئلے پر بات کروں گا۔"

"اچھا!"

"ہاں ہاں، شاعری میں میرا واسطہ اتنا غالب اور اقبال سے نہیں۔ جتنا کہ امیر خسرو سے ہے کیونکہ میں نے شعروں کو اپنے خونِ جگر کے ساتھ خسرو کی موسیقی بھی پلائی ہے۔ ہاں شاعری میں میرا رشتہ، عوامی حد تک نظیر اکبرآبادی سے اُور دینی حد تک مولانا حالی سے ہے۔"

یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ یہ فنِ موسیقی سے اتنے زیادہ واقف ہیں کہ یاروں نے ان پر ازرہِ تفنن سہی، میراثی تک کی پھبتی کسی۔ مگر یہ اپنے من میں پریت بسلے، اپنے من میں پریت، کے قائل ہیں۔ مگر کبھی کبھی تنک کر چیخ بھی جاتے ہیں۔ تو یہ تقاضائے بشری ہے۔

ان کے فنِ موسیقی سے درک کا مذاق اُڑایا گیا۔ ان کی شعری کاوشوں میں اختراعات کی توہین کی گئی مگر یہ بمصداق ؎

اناڑیوں سے تجھے کھیلنا پڑا اے دوست
سمجھا سمجھا کے نئی چال، مات کھائے جا

ایک دن فرمانے لگے :

میں نے سراکبر حیدری کے ہاں دعوتیں کھائی ہیں۔ میں نے سرراس مسعود کے ہاں دعوتیں کھائیں۔ میرے لیے سر عبدالقادر کے ہاں دسترخوان بچھے، میرے لیے شیخ عبداللہ کے ہاں دسترخوان بچھے۔ غرض کیا نواب کیا راجے سبھی کے ہاں مدعو رہا۔

میں یہ سب سُنتا رہا۔

وہ کہنے لگے "میرے ساتھ میرے دوستوں نے اتنی محبت کی کہ میں اس قابل نہ تھا" (ایسا فقرہ میں نے پہلی بار ان کی زبان سے سُنا)

میں سوچتا رہا۔ بے شک دوستوں نے ان کے ساتھ خوب نبھائی اور خوب خوب محبت کی اور مجھے اس امر میں بھی شک نہیں کہ جواب آں غزل کے طور پر

انھوں نے بھی دوستوں سے محبّت کی ہوگی۔ مگر مجھے جس بات میں شک تھا۔ وہ بات میں نے پوچھ ہی لی "کبھی آپ نے بھی اپنے کسی دوست کی دعوت کی ہے؟"

میرے سوال پر پہلے تو حفیظ صاحب چُپ رہے۔ پھر میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔ اس کے بعد مسکرانے لگے۔ جیسے مجھے اپنے سوال پر شرمندہ کرنا چاہتے ہوں چنانچہ میں شرمندہ ہوگیا۔

اسی پر اکتفا نہ کیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد، پھر میرے اُسی سوال کے تتمّہ کے طور پر (اُونچی آواز میں) فرمایا:

"طفیل!"

"جی!"

(اور بلند آواز سے) "طفیل!"

(بہت مدھم آواز میں) "جی!"

اس کے بعد پھر "باتوں میں روشنی نہ رہی" یعنی تکلّم بغیر، دوبارہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ دیکھنے کے بعد دوبارہ مسکرانے لگے اور میں دوبارہ ـــــ

ایک دن میں حفیظ صاحب کے ہاں جا نکلا۔ اتنا ربط ضبط، اتنا خلوص، اتنی محبّت مگر میری نالائقی کہ کبھی ان کے ہاں نہ گیا تھا۔ اچانک مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سینے سے لگایا۔ دعائیں دیں۔ ان کی کوٹھی دیکھی، کچھ کچھ نقشہ اسلامی طرز عمارات کا، اور تو اور کوٹھی میں ایک درخت کھجور کا بھی، میں نے پوچھا "کھجور کا درخت ہے؟"

" ہاں! یہ درخت میں نے بہ طور خاص لگوایا تھا "

" کیوں ؟ "

" اس لیے کہ یہ درخت اسلامی روایات کا مظہر ہے۔ ایک سمبل ہے "

" انسان کا دل مومن ہونا چاہیے۔ ایسی باتوں میں کیا رکھا ہے ؟ "

" رکھا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ یہ علاقہ (ماڈل ٹاؤن) ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ اُن ہندوؤں میں رہ کر جب میں نے یہ کوٹھی بنوائی تو اس پہچان کے لیے کہ یہ کوٹھی مسلمان کی ہے۔ اس کا نقشہ اسلامی عمارات کی طرز پر بنوایا۔ پھر یہ کھجور کا درخت بھی اسی لیے لگوایا "

" اگر آپ اپنی کوٹھی کسی ایسے علاقے میں بنواتے جہاں زیادہ تر مسلمان ہوتے پھر ؟ "

" پھر میں یہ اہتمام نہ کرتا "

" کیوں ؟ "

" وہ کرشن کے ماننے والے ہیں۔ میں محمّد کا چاہنے والا ہوں۔ اگر میں بھی اپنی کوٹھی انہی کے طرز پر بنواتا۔ تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا۔ بے شک یہ بات چھوٹی سی ہے۔ مگر میں یہ تعمیر کرانا چاہتا تھا کہ کوٹھی کسی مسلمان کی ہے اور یہ میرے دل کی خوشی تھی۔ مانتا ہوں کہ یہ کوئی نیکی کا بھی کام نہیں مگر میں کیا کروں۔ میں مسلمان ہوں "

اتنے ڈائیلاگ کے بعد، جب میں ان کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا۔ ایک دیوار

پو عربی کی آیت لگی ہوئی ہے ۔ دوسری پر ان کی اپنی تصویر اور تصویر بھی اس وقت کی جب آتش جوان تھا ۔ ایک طرف شیخ محمد عبداللہ کی تصویر تھی (جو خود شیخ صاحب نے انھیں پیش کی ہوگی ۔ کیونکہ وہ حفیظ صاحب کے بیٹے تھی اور شیخ صاحب کے اس پر دستخط تھے) دوسری طرف سر عبدالقادر کی تصویر تھی مگر ان کے ساتھ حفیظ صاحب بھی موجود تھے ۔

مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا کر ، خود اندر چلے گئے ۔ تصویروں کا البم اُٹھا لائے میں البم دیکھنا نہ چاہتا تھا ۔ میری خواہش تھی کہ کچھ باتیں کروں ۔ پھر میں نے سوچا کہ بے شک تصویریں چُپ رہتی ہیں مگر کہتی تو بہت کچھ ہیں ۔ اس لیے میں انھیں انہماک کے ساتھ دیکھنے لگا ۔ چنانچہ تصویریں بولنے لگ گئیں ۔

یہ تصویریں اُس دَور کی ہیں ۔ جب یہ فوج کے ڈائرکٹر آف مورل تھے ۔ یہ تصویریں اس دور کی ہیں جب یہ لندن میں تھے ۔ یہ تصویریں اُس دور کی ہیں جب یہ کشمیر میں تھے ۔ یہ تصویریں اس دَور کی ہیں جب یہ حیدر آباد دکن میں تھے ۔ یہ تصویریں اس دور کی ہیں جب یہ روس میں تھے ۔

اور یہ تصویر پہلی بیوی کی ہے ۔ یہ تصویر دوسری بیوی کی ہے ۔ یہ تصویر تیسری بیوی کی ہے ۔ یہ تصویر بچیوں کی ہے ۔ یہ تصویر قائد اعظم کی ہے ۔ جن کے ساتھ حفیظ صاحب بھی کھڑے ہیں اور یہ تصویر فاطمہ جناح کی ہے ۔

اس تصویر پر میں چونکا " فاطمہ جناح کی تصویر کے ساتھ ، آپ کی بیگم کی تصویر

ہے اور یہ دُلہن کون ؟"

"یہ شمیم ہے "

"شمیم کون ؟"

قصہ مختصر ! جب میں اپنی بیٹی کی شادی کرنے لگا تو میں نے سوچا ، میرا حلقۂ احباب وسیع ہے ۔ ہر ایک کو بلا نہیں سکتا ۔ اس لیے کیوں نہ کسی ایسی ہستی کو بلاؤں جس کی موجودگی مجھے سب سے بے نیاز کر دے ۔ کسی نے کہا صدر ایوب سے درخواست کیجیے ۔ کسی نے کہا گورنر سے کہیے ۔ میرے دل نے کہا ۔ فاطمہ جناح سے درخواست کروں !

جب میں نے مس فاطمہ سے کہا " میری بچی کی شادی میں شرکت فرما کر میری عزت افزائی فرمائیں تو اُن کا جواب یہ تھا " تُو سرکاری نوکری کرتا ہے اور میں موجودہ گورنمنٹ کی معتوب ہوں ۔ اس لیے میری حاضری پریشانی کا باعث بن سکتی ہے ۔ سوچ لو "

میں نے ایک لمحہ کے توقف کے بغیر کہا " میں نے سوچ لیا ۔ آپ تشریف لائیں "

پھر میں نے دوسری بیوی انیلا کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا " ان سے شادی لندن میں کی تھی ؟"

" نہیں لاہور میں !"

" لاہور میں ؟"

" ہاں !"

" اس کا بھائی سنگاپور میں تھا ۔ فوج میں ملازم ، یہ اس سے ملنے آئی تو لاہور بھی آگئی "

" کیا اس سے پہلے واقفیت نہ تھی ؟"

" تفصیل سے کیوں نہیں بتاتے ۔ مختصر جواب دے کر تجسس نہ بڑھائیں "

" سنو ! جب میں لندن گیا تو مجھے انگریزی نہیں آتی تھی ۔ سر عبدالقادر نے انیلا سے کہا کہ حفیظ کو انگریزی پڑھا دو ۔ چنانچہ میں اس سے انگریزی پڑھتا رہا جب تھوڑی سی شُدھ بدھ بڑھی تو اس نے کہا مشق کے لیے بہتر ہے کہ اپنے حالات کو انگریزی میں بیان کرنے کی کوشش کرو ۔ اس پر عمل کیا تو وہ متاثر ہوئی ۔ اُدھر میں مشاعروں میں پڑھنے لگ گیا ۔ خوب داد ملی ۔ کیونکہ وہاں ہزارہا ہندوستانی تھے جب کبھی انگریزی ترجمے کے لیے اصرار بڑھتا تو سر عبدالقادر مدد کو پہنچتے ۔ یوں میری لندن میں دھاک بیٹھ گئی ۔

پھر جب کچھ عرصے کے بعد انیلا لاہور آئی تو وہ مجھ سے ملی ۔ میری کوئی اولاد نہ تھی ۔ (سچ ؟) میری پہلی بیوی نے سوچا کہ اس نے اولاد کی خاطر شادی تو کرنا ہی ہے اس لیے کیوں نہ اس انگریز عورت سے کرلے ۔ چنانچہ پہلی بیوی کے مشورے سے شادی ہوگئی "

" پھر طلاق کیوں دی ؟"

" گھر میں جھگڑا رہنے لگا۔ پہلی بیوی کا دباؤ بڑھ گیا تھا اور میرا دباؤ گھٹ گیا تھا ۔"

ان کا دباؤ کسی اور طرف بڑھ گیا تھا ۔ جشنِ پنجاہ سالہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یا تو اقبال کی زندگی میں " اقبال ڈے" منایا گیا تھا ۔ یا پھر ان کی زندگی میں جوبلی منائی گئی ۔ پچاس سالہ جوبلی، کرتا دھرتا زیادہ تر فوج کے افسران تھے ۔ ادیبوں اور شاعروں نے کیوں نہ دلچسپی لی ۔ یہ میں نہیں جانتا ۔

جہاں تک ادیب اور شاعر ہونے کا تعلق ہے ۔ وہ فوجی افسران بھی ادیب ہی تھے ۔ شاعر ہی تھے ۔ جن میں بریگیڈیر گلزار احمد کئی کتابوں کے مصنف ہیں ضمیر جعفری بھی ملنے ہوئے ادیب اور شاعر ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ، غرض دیگر ساتھیوں میں بھی لیفٹ رائٹ کرنے والے ادیب ہی تھے ۔ یعنی توفیق جس کو بھی ہوتی، خوش آئند !

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ جشنِ پنجاہ سالگی منانے میں، فوج کے افسروں نے دلچسپی لی تھی ۔ اس کا جواز جشن کے صدر استقبالیہ بریگیڈیر گلزار احمد نے یوں پیش کیا تھا ۔

" بعض حلقوں میں اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا کہ حفیظ کی پنجاہ سالگی کی تقریب میں پاکستان کے فوجی عناصر کیوں پیش پیش ہیں ۔ ہمارے نزدیک یہ چنداں حیرت

کی بات نہیں۔ حفیظ کی شاعری میں جو نمایاں عنصر ہے وہ اسلاف کے زریں کارناموں کی روئیداد ہے اور افواجِ پاکستان کی یہ آرزو ہے کہ وہ شمشیرِ خارہ شگاف کے جوہروں پر قابو پانے کے لیے اپنے اسلاف کو مشعلِ راہ بنا سکیں۔ جب وہ غازیان و مجاہدین اسلام کے کارنامے حفیظ کی زبان سے سنتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ کس قدر بلند مقصد، ان کے سامنے، ایک نحیف سی جان پیش کر رہی ہے۔ اگر وہ اس نحیف سی جان کی درازیِ عمر کی دعاہیں اپنا جائز حصہ لیں تو مجھے یقین ہے کہ اسے مقامِ تعجب نہیں کہا جا سکتا۔ اُمید ہے کہ اسے بے جا تعلی کے جذبے پر محمول نہ کیا جائے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ شاہنامہ اسلام کے عظیم الشان لکھنے والے کی پچاس سالگی منانے کا حق انھی کو حاصل ہونا چاہیے۔ جن کی خواہش ہے کہ فردا فردوسی اُن کے کارناموں کو اسی جذبہ و شوق سے نظم کرے جس طرح دیروز کے درخشاں کارناموں کو حفیظ نے نظم کیا ہے۔ ہاں ہمارا قصور اگر ہے تو صرف اتنا کہ ہم نے حفیظ کی موت کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا!"

پھر ایک اور جگہ لکھا:

"آخر ہم اپنے مقتدر فرزندانِ قوم کی خدمات کے اعتراف کے لیے ان کی موت ہی کا انتظار کیوں کیا کریں۔ کیوں نہ مُردہ پرستی کی روایات کو توڑا جائے۔ اور ساتھ ہی اس کلیہ کو غلط ثابت کر دیں۔ جس کے مطابق اصحابِ قلم کے قلم کی روشنائی اُن کی موت کے بعد ہی، ان کے مداحوں کی آنکھوں میں چمک پیدا کرتی ہے۔"

حفیظ صاحب کو یہ وہم رہتا ہے کہ فلاں فلاں آدمی میرے خلاف ہے اور فلاں فلاں بھی، حالانکہ اس میں اصلیت کم ہوتی ہے۔ چونکہ یہ دَور آدم بیزاری کا ہے۔ اس لیے بھی بہت سی غلط فہمیاں راہ پا جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ جوش ملیح آبادی کو بھی اپنے مخالفین میں گردانتے ہیں۔ حالانکہ جوش صاحب نے ان کے جشن پنجاہ سالگی پر لکھا تھا:

ہم ایک دوسرے سے سینکڑوں بار مل چکے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے حُسن ظن بھی رکھ چکے ہیں اور سُوءِ ظن بھی، ہم ایک دوسرے سے بار بار رُوٹھے ہیں اور بار بار منے ہیں۔ خود بھی روٹھے ہیں اور خود سے منے ہیں۔ نوجوانی کی حماقتوں کا جزر و مد کوئی تفسیر نہیں چاہتا۔ لیکن اب جب کہ ہم دونوں خدا کے فضل یا قہر سے نوجوانی یا جوانی کی منزلوں سے آگے نکل آئے ہیں۔ اس وقت بھی شاید یہ صورتِ حال ہے کہ میں تو اب حفیظ صاحب سے رُوٹھا ہوا نہیں ہوں لیکن حفیظ صاحب منے ہوئے بھی نہیں ہیں۔ یعنی میں بالغ ہو چکا ہوں۔ اُن کے بلوغ میں ابھی غالباً ایک آنچ کی کسر ہے۔ خیر دیر آید درست آید!

یہ درست ہے کہ حفیظ صاحب کے اور میرے افکار و کردار میں شدید اختلاف ہے اور ہمارے فکری و عملی راستے اس قدر مختلف اور دُور دُور واقع ہوئے ہیں کہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی ہم ایک دوسرے کے قریب ہو کر نہیں گزرتے لیکن اس کے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہو سکتے کہ میں حفیظ کے ادبی محامد و محاسن سے روگردانی کا

ارتکاب کر بیٹھوں ۔

ہم ارباب ہند (یعنی ہندوستان و پاکستان) میں یہ بڑا شرمناک عیب ہے کہ ہم اختلافات کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ ایک رائی بھر اختلاف ہمیں پربت بھر مشتعل کر دیتا ہے ۔ ہم انگاروں پر لوٹنے لگتے اور ایک دوسرے کی خوبیوں کو دفن کر کے اس کی خرابیوں کو کریدنے اور اُچھالنے لگتے ہیں ۔ لیکن میرے اور حضرت حفیظ کے مابین، ذہنی و عملی اختلافات کی مجال نہیں کہ وہ مجھے صراطِ مستقیم سے ہٹا کر حفیظ صاحب کے شاعرانہ جمال سے انکار کر دینے کی حماقت میں مبتلا کر دیں ۔ حفیظ صاحب ایک ایسے شیریں مقال شاعر ہیں جو دلوں میں گھر کر چکے ہیں ۔ ان کی شاعری، لطافت، سلاست، مٹھاس، شگفتگی، روانی، رنگینی اور راگنی کی لپٹوں سے مہکی ہوئی ہے ۔ ان کے رسیلے گیت فضاؤں میں، ساون کے بادلوں کی طرح جھوم رہے ہیں اور ان کا دل نشین و سامعہ نواز ترنم ادب کی محراب میں وہ جھنکار پیدا کیے ہوئے ہے کہ زہرا آسمان پر رقص کر رہی ہے ۔"

اس اقتباس سے ایک تو ہلکی سی تردید، مجھے اس امر کی کرنی تھی کہ جوش صاحب حفیظ صاحب کے خلاف نہیں ہیں ۔ ہلکی سی نوک جھونک (دونوں ہی طرف سے) کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کوئی دل سے بھی دُور ہے ۔ اگر جوش صاحب کی تحریر کچھ کہے، ان کے دل میں کچھ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جوش صاحب منافق ہیں ۔ میں جوش صاحب کی اور بُرائیوں کا تو اقرار کر سکتا ہوں مگر یہ اقرار نہیں کر سکتا کہ جوش صاحب

منافق بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے اس اقتباس سے میں یہ کام لینا چاہتا تھا کہ آپ سے عرض کرسکوں کہ اتنے بڑے شاعر کی بھی حفیظ صاحب کے متعلق کیا رائے ہے۔

عبدالمجید سالک نے بھی اپنے تعلقات کا اظہار یوں کیا :

" میں ۱۹۱۶ء سے آپ کی دوستی کا شرف رکھتا ہوں۔ پہلے پہل پلیزنٹ ہاؤس لاہور میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ میں آپ کے شعر و سخن کا، ہمیشہ سے قائل و معترف رہا ہوں۔ آپ کی طبیعت کی بعض خصوصیات مجھے ہمیشہ محبوب رہیں مثلاً خوشحالی و بدحالی دونوں میں خرمی کا دامن ہاتھ سے نہ دیا - اپنی ہر کمی کو محسوس کر کے اس کو پورا کرنے کی کوشش کرنا، اپنے سے بہتر کا کامل احترام اور اپنے سے کمتر پر کامل شفقت، آپ نے صرف اپنی ذاتی محنت اور ثبات و استقلال سے اپنے حالات کو بہتر بنایا اور ہمچشموں میں بلکہ اُوپر کے طبقے والوں میں عزت و توقیر حاصل کی۔ اللّٰھم زد فزد!

میں جانتا ہوں کہ بعض واقعات کا اثر آپ کے قلب پر ہوگا لیکن ایسے مکروہ اثر کو پائیدار بنا لینا اس دنیائے اغراض میں باعثِ راحت نہیں ہوسکتا۔

باہمیں مرداں بباید ساخت!"

سالک صاحب کی رائے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ ہر حال میں مست رہے ہیں۔ اچھے حال میں بھی، بُرے حال میں بھی، پھر جو سالک صاحب نے فرمایا کہ بعض واقعات کا اثر آپ کے قلب پر ہوگا۔ وہ شاید اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ جو واویلا حفیظ صاحب

کے ترانہ کی منظوری کے بعد مچا تھا۔ حفیظ صاحب کے خیال کے مطابق، اس واویلا میں، درپردہ سب سے بلند آواز سالک صاحب ہی کی تھی۔ کیونکہ سالک صاحب نے بھی ترانہ پیش کیا تھا۔ شاید یہی امر بدگمانی کا باعث بنا ہو۔

کسی شخصیت کو جانچنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے دوستوں سے بھی باتیں کی جائیں۔ ہلکا ہلکا سا عکس پہلے بھی ملاحظہ سے گزرا ہو گا۔ تھوڑی سی جھلک اور سہی!

عبدالرحمٰن چغتائی، جنھیں مصورِ ایشیا کہنا چاہیے۔ ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ انھوں نے حفیظ صاحب کے بارے میں لکھا:

"میں آپ کا مداح ہوں۔ دوست بھی اور بھائی بھی، میں نے آپ کو قریب اور دُور سے دیکھا ہے۔ آپ نے جس ہمّت سے اپنے فرائض کو انجام دیا ہے۔ میں نے اپنے دوستوں میں ویسا کوئی نہ دیکھا۔ دنیا میں زندہ رہنا صرف اُسی کا حصّہ ہے جو دُنیا کے دامن کو پکڑ کر بلندی کی طرف اُڑتا ہے اور اپنی بلندی سے دوست اور دشمن پیدا کرتا ہے۔ میں نے فنی نکتہ نگاہ سے آپ کے کارناموں پر تنقید بھی کی ہے مگر سراہا اس طرح ہے کہ حفیظ نے شعر کو زندہ رکھنے کے لیے ہر ممکن اور غیر ممکن آزمائش میں اپنے آپ کو ڈالا اور پار نکل گیا۔ اگرچہ اس کے دوستوں کو اس سے زیادہ وسائل حاصل تھے۔ زیادہ مطالعہ اور علم تھا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ حالانکہ رسائل اور اخبارات کی پشت پناہ تھے۔ حفیظ ایک مخلص دوست ہے جس نے دوستوں کی نکتہ چینی پر کان

نہیں دھرا بلکہ یہ نکتہ چینیاں اور تنقید ہی تو ہے جس نے اسے زندہ جاوید بنا دیا ۔"

مندرجہ بالا اقتباس کے سلسلے میں ایک نکتہ قابلِ غور ہے کہ انھیں دوستوں کی نکتہ چینیوں نے ہی اس مقام پر پہنچا دیا ۔ ورنہ ایک بے یار و مددگار انسان کربھی کیا سکتا تھا ۔ تازیانوں کے بغیر اس بلندی تک پہنچنا آسان نہ تھا ۔ بے شک یہ علم میں فرومایہ تھے مگر ان کی لگن اور عشق نے ہر منزل کو آسان بنا دیا ۔ یہ حوصلہ شکنیوں کی بھٹی میں اتنی بار تپے کہ کُندن ہو گئے ۔

◆

سر عبدالقادر اپنے وقت کے ایک بڑے آدمی تھے۔ عزّت و اہمیّت کے اعتبار سے بھی، اپنے علمی مرتبے کے اعتبار سے بھی، یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال جیسے باکمال شاعر نے، اپنی کتاب کا دیباچہ سر عبدالقادر سے لکھوایا اور یہ شرف صرف سر عبدالقادر کو ہی حاصل ہوا۔

ادب میں ان کی آمد کا وہ طنطنہ تھا کہ ان کے رسالہ "مخزن" کا کوئی نہ تھا۔ وہ ادب کے ایسے ناخدا کے رُوپ میں سامنے آئے کہ باقی سارے چراغ گُل ہو گئے۔

آج ہم عبدالقادر کو بھی بھُولتے جا رہے ہیں۔ کہاں وہ وقت تھا کہ وقت کی نبض پر عبدالقادر کا ہاتھ تھا۔ آج وقت کی نبض پر ہماری بے حسی کا ہاتھ ہے۔ سُنا ہے کہ جو قوم اپنے محسنوں کو بھُول جاتی ہے۔ اُس قوم کا دنیا کے نقشے پر، جغرافیہ بھی بدل جاتا ہے۔

ہاں تو اُسی سر عبدالقادر کے بارے میں، حفیظ صاحب کہتے ہیں کہ میرے ذہن کو اُجالنے میں سر عبدالقادر کا بڑا ہاتھ ہے۔ دوسرے جب بھی مجھے کوئی پریشانی ہوتی۔ میں اُن سے ضرور کہتا اور وہ مجھے اسی انداز میں سمجھاتے کہ تسلی ہو جاتی۔ مثال کے طور پر کہتا "فلاں شخص گالیاں دیتا ہے"۔

"دینے دو"

"کیوں؟"

"خود بے وقعت ہو جائے گا"

"یا جو کام اُن کے کرنے والا ہوتا از خود کر دیتے یا کرا دیتے۔ بار بار درخواست کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اگر میری زندگی سے سر عبدالقادر کی محبت اور شفقت کو نکال دیا جائے تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہ جاتا"۔

سر عبدالقادر نے ایک مرتبہ اپنے بچوں سے کہا "دیکھو حفیظ تمہارا بڑا بھائی ہے۔ میری کوئی جائیداد نہیں۔ ورنہ میں اسے بھی اس میں حصّہ دار بناتا۔ اب یہ ہے کہ تم اسے بھائیوں والی محبت ضرور دینا"۔

وہ ہر معاملے میں حفیظ صاحب کے لیے سپر بنے۔ جب حفیظ صاحب نے شاہنامہ اسلام چھاپنے کا اعلان کیا تو یاروں نے کہا "اس نام سے فردوسی سے برابری کا دعویٰ نکلتا ہے کسی نے کہا۔ پہلے حصّہ میں مذہبی بادشاہوں کا حال درج ہوگا۔ آگے چل کر دنیاوی بادشاہوں کے حالات ہوں گے اور یہ کیسی بے جوڑ سی بات ہوگی۔

سرعبدالقادر نے کہا" میں سمجھتا ہوں کہ بہ حیثیت مجموعی شاید کسی اور نام سے اس جامعیت کے ساتھ مصنف کے ارادے کا اظہار نہ ہو سکتا۔ پیغمبرِ اسلام شاہِ دین بھی تھے اور شاہِ دُنیا بھی، یہی حال خلفائے راشدین کا تھا۔ پس انھیں شاہ کہنا اور ان کے حالات کا نام شاہنامہ رکھنا بھی غیر موزوں نہیں ہے۔ بلکہ اگر صرف انھی بزرگانِ دین کا حال اس میں درج ہوتا تو میں شہنشاہ نامہ کہتا۔"

سرعبدالقادر، حفیظ صاحب سے اپنی ملاقات کا حال یوں بیان کرتے ہیں :

"جب میں نے حفیظ صاحب کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ شاید اکثر لوگوں نے بھی انھیں لاہور میں اس زمانے میں دیکھا ہو۔ اس سے پہلے کوئی انھیں پہچانتا نہ تھا۔ مگر پہلے ہی موقع پر جب وہ لب کُشا ہوئے تو سب جان گئے اور مان گئے کہ ادبِ اُردو پر ایک نیا ستارہ چمکا ہے۔"

تفصیل یوں بتائی :

"لاہور میں ایک بڑا مشاعرہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کی کُرسیوں پر چند کہنہ مشق شاعر متمکن ہیں اور اُن میں ایک نوعمر سا دُبلا پتلا شخص، بہت سادہ لباس پہنے ہوئے بیٹھا ہے۔ جو ہر ایسے شعر پر، جو داد کے قابل ہو داد دیتا ہے اور یوں اس کے دل کی کیفیت ایک خاص طرزِ اظہار رکھتی ہے بعض شعر سُنتے ہی وہ ہمہ تن داد بن کر اپنی جگہ سے اُٹھنے کو ہوتا ہے اور اپنا دایاں ہاتھ پھیلا کر اور انگشتِ شہادت شاعر کی طرف اُٹھا کر کہتا ہے" کیا بلند شعر ہے۔"

یہ بے ساختہ اظہارِ خیال چونکہ کسی قدر نرالا تھا، میری توجہ اس طرف ہوئی، میں نے کسی سے پوچھا۔ یہ کون صاحب ہیں؟ انھوں نے کہا۔ یہیں نام تو معلوم نہیں مگر سُنا ہے کہ جالندھر سے آئے ہیں اور مولانا گرامی کے شاگرد ہیں۔

میں مولانا گرامی کے فارسی کلام کے مداحوں میں تھا اور اُن سے ذاتی مراسم رکھتا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی اسی طرح اُنگلی اُٹھا کر اور یہ کہہ کر کہ "اُدپچھے پاٹے کا شعر ہے" اپنے دوستوں کے کلام کی داد دیا کرتے تھے۔ شاگرد میں کچھ اُستاد کی جھلک نظر آئی اور میں انتظار میں بیٹھ گیا کہ ان کا کلام سُن کر جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد حفیظ صاحب کی باری آئی۔ جب پڑھنے کو اُٹھے تو ایک اور مشابہت ان میں اور ان کے اُستاد میں نظر آئی۔ نہ اُن کے چہرے سے علم ہوتا تھا کہ وہ فارسی کے ایسے ادیب اور نامور شاعر ہیں۔ نہ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ اُردو نظم میں ایسی دستگاہ رکھتے ہیں مگر ہوا یہ کہ ایک تو ان کا کلام سادہ و پُرکار تھا اور دوسرے آواز دلکش، نظم کے سے پڑھی گئی اور جلسے پر بیخودی چھا گئی۔ میں نے اس کے بعد بار ہا حفیظ کو بڑے بڑے جلسوں کو مسحور کرتے دیکھا ہے اور اُن کی پُر اثر لَے سُنی ہے۔ جس سے اب ہندوستان میں دکن تک لوگوں کے کان آشنا ہو چکے ہیں۔ مگر اُس دن کی کیفیت چونکہ اپنے رنگ میں بالکل نئی تھی۔ اس لیے نہیں بھولتی"۔

حفیظ صاحب نے بتایا کہ میں بیمار تھا۔ سر عبدالقادر میری عیادت کو آئے۔ اُن دنوں شیخ صاحب انڈیا آفس کے وزیر تھے۔ مجھے اعصابی تکلیف تھی۔ منٹوں میں

نلپٹ ہوجاتا تھا۔ اچھا بھلا ہوتا۔ ایکدم نبض ٹوٹ جاتی۔ تقریباً موت اور زیست کے درمیان معلق تھا۔ اس پر بھی لوگ مشاعروں میں شرکت پر اصرار کرتے۔ انہی کے سامنے بیٹھے بیٹھے کچھ لوگ کہہ رہے تھے "مشاعرہ ہے۔ آپ کا تشریف لانا ضروری ہے"۔

"میری یہ حالت ہے۔ کیسے حاضر ہو سکتا ہوں"۔

"شاعر بیمار نہیں ہوتا۔ وہ تو خود بیماروں کا علاج ہوتا ہے"۔ ایسے مکالمے شیخ صاحب کے سامنے ہوئے تھے۔ [جب شیخ صاحب نے کہا کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تو میں نے کہا "یہاں آرام کہاں؟ لوگ تو مجھے اس حالت میں بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں زندہ رہوں تو مجھے اس ماحول سے نکالیے اور اپنے ساتھ لندن لے چلیے"۔

"لندن؟"

"ہاں لندن!"

"میں تو دو ہفتوں کے بعد جارہا ہوں۔ کیا تم اتنی جلدی تیار ہو سکو گے؟"

"میرے دو کام کرا دیجیے"۔

"وہ کیا؟"

"ایک تو حیدرآباد دکن سے جو میرا تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر ہے۔ وہ مجھے سر اکبر حیدری سے کہہ کر، وہیں لندن میں دلوا دیجیے۔ دوسرے میری سیٹ اپنے ساتھ بک کرا دیجیے"۔ چنانچہ وہ دونوں کام ہو گئے۔ سر عبدالقادر رسوخ والے آدمی تھے۔

انھوں نے پہلے تو سر اکبر حیدری کو ٹیلی فون کیا۔ وظیفے والا معاملہ طے کیا۔ پھر جہاز راں کمپنی سے کہہ کر بات پکی کرادی۔ یوں مہینوں کے کام دو تین دن میں طے پاگئے اور میں اُن کے ساتھ لندن کے لیے چل پڑا۔ مگر یہ بتادوں۔ کرایہ میں نے خود ادا کیا تھا کیونکہ میرے پاس رقم تھی۔ نہ صرف کرایہ خود ادا کیا۔ بلکہ چار پانچ ہزار ساتھ بھی لے گیا تھا۔ اُن دنوں میرا اکاؤنٹ ایک مسلم بینک میں تھا۔ جو میرے بعد ٹوٹ گیا تھا اور اس میں میرا تیرہ ہزار روپیہ ضائع ہوگیا تھا۔ اگر میں لندن نہ جاتا تو وہ رقم بھی جو ساتھ لے گیا تھا ڈوب جاتی۔

یہ بھی بتایا کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں، مَیں شملہ میں تھا۔ انسان کٹ رہے تھے۔ اِدھر ہندو سکھ، اُدھر مسلمان، میں بھی بُری طرح گھرا ہُوا تھا۔ حملے پہ حملے ہو رہے تھے۔ مسلمان پہ مسلمان کٹ رہے تھے۔ اُن دنوں شیخ صاحب بھی شملے میں تھے۔ وہ بھی پریشان تھے۔ سر عبدالقادر کے لڑکے الطاف قادر باؤنڈری فورس میں تھے۔ اب تو وہ بڑے افسر ہیں۔ اُن دنوں لیفٹیننٹ کرنل وغیرہ تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ایک ٹرک لے کر پہنچے۔ سر عبدالقادر نے کہا "حفیظ پہلے تم اپنے بیوی بچّوں کو لے کر بیٹھو۔ جب تک ہم سب بیٹھ نہ گئے۔ وہ برابر کھڑے رہے۔ بعد میں خود بیٹھے۔ راستے میں ٹرک روکا جاتا تھا۔ تلاشی لی جاتی تھی۔ ایک دو جگہ اس امر کی سازش بھی ہوئی کہ انھیں کسی بہانے سے روک کر ختم کر دیا جائے۔ لیکن الطاف قادر کی سوجھ بوجھ اور تدبّر کی وجہ سے بچ ہی نکلے۔ چنانچہ جب میں لاہور پہنچ گیا تو بھی شیخ صاحب نے یہی مناسب سمجھا کہ میں

انہی کے ہاں کچھ دن گزاروں تاکہ ذہنی صدمے کسی حد تک تو دُور ہوں۔ ورنہ جو کچھ میں نے دیکھا تھا۔ جو کچھ میرے ساتھ گزری تھی۔ اُن کی موجودگی میں عین ممکن تھا کہ حواس کھو بیٹھتا۔ کیونکہ اُن دنوں میں بار بار شیخ صاحب سے پوچھا کرتا تھا "شیخ صاحب کیا ہم لاہور پہنچ گئے ہیں ؟"

"ہاں بھئی، ہاں! — یہ دیکھو، یہ ٹمپل روڈ ہے۔ وہ سامنے مال روڈ ہے۔ اور وہ اسمبلی ہال ہے "

"اب اِدھر تو کوئی سکھ نہیں۔ جو ہمیں جان سے مار دے گا۔ اب اِدھر تو کوئی چھُرا لے کر ہمارے پیچھے نہ بھاگے گا ؟"

"نہیں نہیں!"

جب تک میری ذہنی حالت نہ سنبھلی۔ شیخ صاحب نے مجھے اپنے سے جُدا نہ کیا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ میں پاکستان پہنچ کر بھی ذہنی طور پر مر جاتا۔"

پاکستان بننے کے بعد، اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قائدِ اعظم پہلی بار لاہور تشریف لائے تو یونیورسٹی گراؤنڈ میں بہت بڑا جلسہ ہوا۔ اس موقع پر میں نے پنجاب کے امیروں اور وزیروں کی موجودگی میں، اپنے قائد کے سامنے، مہاجرین کے ناگفتہ بہ مسائل پر ایک احتجاجی نظم پڑھی۔ وہ یہ کہ

یہ صابر ہیں کوئی شکوہ نہیں اغیار سے ان کو
شکایت ہے فقط اپنے ہی گھر کی مار سے ان کو

زمانہ منقلب ہے آسماں بدلا، زمیں بدلی
مسلمان افسروں نے اپنی خوخصلت نہیں بدلی

جب میں نے یہ شعر پڑھا تو وزیروں کے رنگ فق ہوگئے۔ قائداعظم بھی مضطرب ہوگئے۔ پھر جب میں نے یہ اشعار پڑھے :-

گرے ہیں بن کے کرگس زندہ انسانوں کی لاشوں پر
کوئی نسخہ نہیں ہے کارگر ان بدمعاشوں پر

نہ منت کا اثر ان پر نہ یہ سنتے ہیں فریادیں
یہ ظالم کھودتے جاتے ہیں پاکستاں کی بنیادیں

خدارا قائداعظم تو ہی تادیب کر ان کو
انھیں تعلیم دے، نہ بخیرئی تہذیب کر ان کو

تو قائداعظم نے وہیں بیٹھے بیٹھے نواب ممدوٹ سے کہا "حالات فوری طور پر ٹھیک ہونے چاہئیں۔ آئندہ ایسی شکائتیں نہ سنوں"

اور اس جرأت رندانہ پر، قائداعظم نے حفیظ صاحب کی پیٹھ ٹھونکی۔ شاباش دی! حفیظ صاحب کو قائداعظم سے بڑی عقیدت ہے۔ یعنی وہ اپنے نام کے ساتھ بار بار ان کا بھی نام لیتے ہیں۔ پہلے تو میں نے اس ورد کو حفیظ صاحب کا احساس کمتری ہی جانا۔ پھر جب دیکھا کہ ان کے کن کن ہستیوں سے تعلقات رہے ہیں تو وہم خود بخود باطل ہوگیا۔ متحدہ ہندوستان میں بھی کوئی ایسا بڑا شخص نہ تھا جن سے ان کے ذاتی مراسم نہ ہوں اور

نہ ہی کوئی پاکستان میں ایسا شخص ہے جو نمایاں ہوا اور اس سے حفیظ صاحب کے تعلقات نہ ہوں ۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ تعلقات کی استواری ہیں، حفیظ صاحب کا خلوص زیادہ موثر وار کرتا ہے ۔ وہ کسی سے بھی ملنے میں اپنی توہین نہیں سمجھتے ۔ میں اپنی بات کرتا ہوں ۔ مجھ سے حفیظ صاحب کو کوئی دنیاوی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ۔ مگر مجھ سے ملنے جب بھی آئے ہیں حفیظ صاحب ہی آئے ۔ مجھے کبھی بھی توفیق نہ ہوئی کہ میں بھی سلام دعا کے لیے پہنچتا ۔ سوائے اس ایک ملاقات کے، جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں ۔

ہاں تو میں اپنی بات یہ آتا ہوں کہ یہ اکثر قائداعظم سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کیا کرتے ہیں ۔ اسی ضمن میں انھوں نے بتایا ۔ ۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو مجھے قائداعظم نے طلب فرمایا اور حکم دیا "کشمیر جاؤ، افواج پاکستان کو تمہارے بڑھاووں کی ضرورت ہے "

" جی ! "

" اور اس وقت تک واپس نہ آنا جب تک تم زندہ ہو "

" بہت بہتر ! "

" جلد سے جلد پہنچو ۔ مجھے اتنی دیر بھی پسند نہیں ۔ جتنی کہ تم چائے پینے میں صرف کرو گے ! "

سر راس مسعود سے بھی، ان کے بڑے اچھے مراسم تھے ۔ وہ بھی حفیظ صاحب کو

خوب چاہتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر کھل جایا کرتے تھے۔ غرض ایک دوسرے کے بارے میں نیک ہی نیک جذبات تھے۔ یہ انھیں باپ کی طرح چاہتے تھے۔ وہ انھیں بیٹے کی طرح!

راس مسعود نے جب علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری سنبھالی تو ان کی اچھی خاصی مخالفت ہوئی۔ غالباً سر راس مسعود سے پہلے سر ضیاء الدین وائس چانسلر تھے۔ انھوں نے راس مسعود کے خلاف اُودھم مچایا۔ حالانکہ ان کی موجودگی میں یونیورسٹی کی حالت، خاصی ابتر تھی۔ یہ کس طرح دیکھ سکتے تھے کہ ان کے دادا کی بنائی ہوئی ایک عظیم یونیورسٹی تباہ ہو جائے۔ جو مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی تھی اور جس کے لیے پوری قوم نے ایثار سے کام لیا تھا۔

انھی دنوں کانپور میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس کی صدارت سر راس مسعود نے قبول کی تھی۔ مخالفین نے سوچا، وہاں بھی راس مسعود کی خبر لی جائے۔ چونکہ یہ وعدہ کر چکے تھے۔ اس لیے پیچھے ہٹنے کا سوال نہ تھا۔ انھوں نے حفیظ کو بھی لکھا۔ مشاعرہ میں آنا، یہ بھی بتایا کہ میں فلاں ٹرین سے جاؤں گا۔ بہتر ہو گا کہ اکٹھا چلیں۔

انھوں نے کسی وجہ سے معذوری کا اظہار کیا۔ اُن کا پھر خط آیا۔ "کانپور میں میرے مخالفین بڑے زوروں پر ہیں۔ انھوں نے مجھے وہاں پر ذلیل کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ خطوط بھی آ رہے ہیں کہ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ لوگ اینٹیں اور پتھر مارنے کا پروگرام بنائے ہوئے ہیں۔ کیا اس موقعہ پر بیٹا باپ کا ساتھ نہ دے گا؟"

ایسے خط پر حفیظ صاحب کا رُکنا مشکل ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق اکٹھے ہی پہنچے۔ چونکہ یہ مشاعرہ ایک کانفرنس کے موقعہ پر ہو رہا تھا اور کانفرنس کا افتتاح گورنر ہیلی کر رہے تھے (جو کہ دن کو تھا) جو حفیظ صاحب کے پہلے ہی سے جاننے والے تھے۔ مشاعرہ رات کو تھا۔ حفیظ صاحب سر راس مسعود کے ساتھ ڈائس پر بیٹھے تھے۔ باقی شعرا سامنے کی قطار میں، اب باقی شعرا کا اصرار یہ تھا کہ حفیظ صاحب بھی ہمارے ساتھ آ کے بیٹھیں۔ کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اتنے میں گورنر صاحب آ گئے۔ وہ بھی حفیظ صاحب سے تپاک سے ملے۔ پھر تو باقی شعرا اور حیران ہوئے۔ انھوں نے سوچا۔ اب وہاں سے حفیظ صاحب کو اُٹھانا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ سب چپ ہو گئے۔

ایک ایک کر کے شعرا پڑھنے گئے۔ جب گورنر صاحب کے جانے کا وقت آنے لگا تو سر راس مسعود نے کھڑے ہو کر، میرا نام لیے بغیر تعریف شروع کر دی کہ اب میں ایک ایسے شاعر کو زحمت دینے والا ہوں، جس کی خدمات بے پناہ ہیں۔ جو موجودہ ہندوستان کا بہت بڑا شاعر ہے۔ پھر اس میں اور مجھ میں ایک بات مشترک بھی ہے کہ وہ بھی میری طرح گنوار ہے۔ میری مراد جناب حفیظ جالندھری سے ہے"

اس تمہید کے بعد، جب حفیظ صاحب نے پڑھنا شروع کیا تو سماں بندھ گیا۔ اُن دنوں آواز میں بھی لوچ تھا۔ شعروں میں بھی نکھار تھا۔ خُوب چمکے۔ باقی چراغ ٹمٹما کے رہ گئے۔ اور — اور — اور — کا شور بڑھتا ہی چلا گیا۔ چنانچہ صاحب صدر نے کہا۔ گورنر صاحب تشریف لے جا رہے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد آپ کی خواہش

کا احترام کیا جائے گا۔ باقی شعرا کے ساتھ حفیظ صاحب بھی اپنا کلام مزید سنائیں گے۔
پروگرام کے مطابق مخالفین مسعود بھی جو کس ہو بیٹھے تھے۔ شعرا کا ایک بڑا حلقہ بھی
ٹھنکا بیٹھا تھا۔ سبھی نے آکر، اپنا اپنا رنگ جمانے کی کوشش کی۔ مگر بات نہ بنی۔ لوگ
حفیظ صاحب، حفیظ صاحب ہی پکارتے رہے۔ ناچار انھیں پکارا گیا "لوگ" اپنے
پروگرام کی تکمیل کو بھول کر، ان کے کلام کے سحر میں کھو گئے۔ رات تین بجے تک مشاعرہ
برپا رہا اور کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آیا۔

مندرجہ بالا واقعہ تو میں نے کسی اور دوست سے سُنا تھا۔ تکمیل حفیظ صاحب
نے کر دی۔ وہ یوں کہ میں نے مندرجہ بالا واقعہ یاد دلایا تو کہنے لگے۔ مشاعرے سے
واپسی پر میں نے سر راس مسعود سے کہا "جناب! آپ نے تو فرمایا تھا کہ مشاعرے میں اینٹیں
برسیں گی۔ وہ تو نہ برسیں"۔

"ضرور برستیں، لیکن اُن پر تیرا جادو چل گیا"۔

مجھے حفیظ صاحب کی یہ خوبی بھاتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی، یہ اپنے محسنوں
کو نہیں بھولے، جنھیں کہ یہ زندگی میں سراہتے رہے۔ نہ صرف سراہتے رہے بلکہ فیض
اُٹھاتے رہے۔ ورنہ یہ دَور تو بڑا محسن کش ہے۔ اُدھر آنکھ بند ہوئی۔ اِدھر
سارے ناطے ختم، لیکن حفیظ صاحب نے اپنے محسنوں کو مرنے کے بعد بھی یاد رکھا۔
میری مراد سر عبدالقادر اور سر راس مسعود سے ہے۔ جب راس مسعود کا انتقال ہُوا
تو نوحہ یوں کہا :

وہ اک نمونۂ اخلاص و پیکرِ ایثار
جسے نہ ذوقِ نمائش نہ شوقِ نام و نمود
مری جبینِ عقیدت کو چُومنے والا
مرا شفیق، مرا قدرداں، مرا مسعود
وہ اِک دارِ اماں مرا بروئے زمیں
وہ اِک پناہ تھی میری بزیرِ چرخِ کبود

سرعبدالقادر کے انتقال پر یوں ملول ہوئے :۔

تیر وہ آکے لگا ہے جو گماں میں تو نہ تھا — قدر اندازی چشمِ نگراں میں تو نہ تھا
ہائے یہ رگ تو کہیں دل نے چھپا رکھی تھی — ہائے یہ زخم میرے وہم و گماں میں تو نہ تھا

آہ یہ درد کہ فریاد کی بھی تاب نہیں — آہ یہ جسمِ ضعیف آہ میری جانِ حزیں
کوہِ اندوہ کہاں، یہ تو فلک ٹوٹ پڑا — دستِ قدرت تیرا شہکار تھا عبدالقادر

خاص کچھ مجھ سے نہ تھا شیخ صاحب کا فیضانِ عظیم — ذرّے ذرّے پہ گہر بار تھا وہ ابرِ کریم
اے قضا دیکھ گلستانِ ادب کی صورت — ایک میں ہی نہیں دُنیا ہے میرے ساتھ یتیم

یہ دونوں مرثیے خاصے طویل ہیں۔ میں نے تو یہاں صرف چند اشعار نقل کیے ہیں۔ یہ مرثیے بھی ویسے ہی ہیں۔ جیسے حالی کا مرثیہ غالب کے بارے میں یا علامہ اقبال

کا اپنی والدہ کے بارے میں، تاثر میں ڈوبے ہوئے عقیدت میں اپنی آخری حدوں پر، —
اقبال کے بارے میں جو انھوں نے مرثیہ لکھا تھا۔ اس کا ذکر پہلے ہی کر چکا ہوں۔ یعنی :-

اقبال بلند تھا ہمارا
اب اور بلند ہو گیا ہے

شیخ محمد عبداللہ، جنھیں شیرِ کشمیر بھی کہا جاتا ہے۔ اُن سے بھی ان کے بڑے تعلقات
ہیں۔ پسِ دیوار بھی ایک دوسرے کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔
ان کے ڈرائنگ روم میں شیخ عبداللہ کی تصویر رکھی ہے۔ جسے شیخ صاحب نے بڑی محبت کے
ساتھ، اپنی نیک خواہشات کا اظہار کر کے، حفیظ صاحب کی خدمت میں پیش کر رکھی ہے۔

جب شیخ عبداللہ، پنڈت نہرو کے ایما پر، پاکستان پہنچے تھے کہ کشمیر کے مسئلے پر
ابتدائی گفتگو ہو جائے تو حکومتِ پاکستان نے شیخ صاحب کے لیے، افسر مہمان داری جنھیں
مقرر کیا تھا۔ وہ حفیظ صاحب تھے۔ عرصے کے بعد دونوں یار ملے تھے۔ خوب گھُل مل
کے ملے۔ شیخ صاحب جتنے دن بھی پاکستان رہے۔ انہی کے جلو میں رہے۔

پھر قیامِ پاکستان سے پہلے، جب بھی شیخ صاحب لاہور آتے تھے۔ انہی کے پاس
ٹھہرتے تھے۔ اس لیے میرا بھی شیخ عبداللہ کے متعلق استفسار ضروری ہی تھا۔ پوچھا۔ ان
سے کیسے تعلقات ہیں؟ کب سے دوستی ہے؟

"بھائیوں جیسے تعلقات ہیں۔"

"کب سے؟"

" غالباً ۱۹۲۲ء سے، میں نے کشمیر کے بارے میں ایک نظم لکھی تھی۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب کہ میں پہلی بار کشمیر گیا تھا۔ وہاں وہ نظم کہی تھی۔ جو اَب میرے کسی مجموعے میں نہیں۔ اُسے پڑھ کر ایک طالب علم قسم کا شخص میرے پاس آیا تھا۔ کہنے لگا "آپ کی نظم نے تو میرے دل میں آگ لگا دی ہے "۔

"یہ میرے دل کی آگ ہے۔ اگر آپ کے بھی دل میں لگی ہے تو مجھے خوشی ہوئی۔ جب وہ صاحب جانے لگے تو اُس نے کہا "میرا نام عبداللہ ہے۔ اسکول میں پڑھتا ہوں"

وہ کون سی نظم تھی ؟ کیا اس کی نقل نہیں مل سکتی ؟ ٹھہرو ! ڈھونڈ کے لاتا ہوں۔ چنانچہ وہ دوسرے کمرے میں گئے۔ وہاں سے اپنی ایک پرانی بیاض اٹھا لائے۔ بیاض کا نام "جامِ جم" تھا۔ جس پر ۱۹۲۰ء لکھا تھا۔ یعنی وہ نصف صدی پرانی بیاض تھی۔ وہ نظم ڈھونڈتے رہے جو ل گئی۔ افسوس کہ میں اُسے نقل نہ کر سکا۔

حفیظ صاحب نے بتایا کہ اس کے بعد میں برابر کشمیر جاتا رہا۔ تقریباً ہر سال، پہلی مرتبہ ویری ناگ میں ٹھہرا تھا۔ جبھی تذکرہ نظم کہی تھی۔ اس وقت میں جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ اس کا کرایہ صرف آٹھ آنے روز تھا۔ بعد میں، میں نے ایک بوٹ خرید لیا تھا۔

ایک دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ وہی لڑکا ہے جو مجھے ایک بار ملا تھا۔ میں تو اُسے بھول چکا تھا۔ مگر میں اس نام سے ایک کشمیری لیڈر کی حیثیت سے خوب آشنا تھا۔ تقریریں پڑھتا تھا۔ جلسے جلوس کا حال جانتا تھا۔ عرصے کے بعد، ایک دن میں نے سُنا کہ شیخ صاحب مجھے ملنے کے

لیے آرہے ہیں۔ میں حیران! دیکھا کہ کئی شہری اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ شیخ صاحب آ گئے، شیخ صاحب آ گئے۔ اتنے میں ایک شخص میرے قریب آ کے کھڑا ہو گیا اور کہا "مجھے پہچانا"؟

"ارے عبداللہ!" اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ وہی عبداللہ ہے جو عرصہ پہلے مجھے ملا تھا۔ شیخ صاحب کافی دیر میرے پاس بیٹھے رہے۔ اُن سے لوگوں کی عقیدت کا اس وقت بھی یہ حال تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں لوگ اکٹھا ہو گئے۔ دوسری کشتیوں میں کھانے پینے کی چیزیں آنے لگیں۔ میں جو ان کی تواضع کے لیے، ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ خود میری بھی تواضع کے لیے بہت کچھ اکٹھا ہو گیا۔

میں نے دریافت کیا "ملاقات کا مقصد کیا تھا؟"

بتایا گیا "بیٹھے ایک دوسرے کا احوال پوچھتے رہے"

"صرف احوال؟"

"ریاستی سیاست پر گفتگو کرتے رہے مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے۔ اُن سے نجات کے راستے تلاش کرتے رہے — اس کے بعد قیامِ پاکستان تک برابر ملنا جلنا رہا۔ برابر ایک دوسرے کے دُکھ بانٹتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی باقاعدہ خط و کتابت ہی۔ ملاقات میں باخط و کتابت میں رخنے اُس وقت پڑتے جب شیخ صاحب جیل میں ہوتے یا کوئی پابندی ہوتی۔ جیل میں شیخ صاحب ایسے شوق سے جاتے تھے۔ جیسے دُولھا سسرال جاتا ہے۔

کشمیر میں ہر سال نمائش ہوا کرتی تھی۔ ستمبر میں کہ جب سیزن ختم ہونے والا ہوتا۔ اِدھر اُدھر سے سب لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ میلے کی سی کیفیت ہوتی۔ مشاعرہ بھی ہوتا۔ ۱۹۳۵ء میں شیخ عبداللہ نے کہا۔ اب تو کشمیر کا آپ پر بھی حق ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر ایک اور نظم لکھیں اور کیفیت او تاثر وہی ہو کہ جو پہلا آپ کی پہلی نظم پڑھ کر ہوا تھا۔

شیخ صاحب سے اتنے تعلقات تھے کہ اس وقت نہ کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ نمائش میں صرف تین دن باقی تھے۔ چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کر نظم شروع کر دی۔ پچاس بند لکھے اور میری وہ نظم ہے "ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا"

ایک بند سنو:

چار سُو پہرے کھڑے ہیں ساکت و صامت خموش
تاجِ نُور ان کے سروں پر جسم ان کے سبز پوش
ایک ہی قانونِ قدرت کے ہیں یہ حلقہ بگوش
کچھ نہیں جز خدمتِ کشمیر کہساروں کو ہوش
روکتے ہیں راستہ ہر دشمنِ بے پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کشمیر سے حفیظ صاحب کو والہانہ عشق ہے۔ جتنے جذب کے ساتھ انھوں نے کشمیر کے بارے میں نظمیں لکھی ہیں۔ کم کسی نے لکھی ہوں گی۔ مندرجہ بالا نظم کے علاوہ

ان کی ایک اور طویل نظم ہے "خون کے داغ"۔ اس کے بھی دو چار شعر سن لیجیے۔ جہاں شاعر کشمیر کی رعنائیوں کی تعریف کرتا ہے وہاں وہ یہ بھی کہتا ہے :

معرکہ آراؤ ، ہاں آگے بڑھو، بڑھتے چلو　　غاصبوں پر تُند شیروں کی طرح بڑھتے چلو
اب تمہارے ہاتھ اس آغاز کا انجام ہے　　ہم یہاں کام آگئے، آگے تمہارا کام ہے
سرفروشو ان چراغوں سے ضیا لیتے ہوئے
آگے اور آگے بڑھو نام خدا لیتے ہوئے

یہ نظم اتنی پسند کی گئی کہ خود شیخ صاحب نے بے حد داد دی۔ انھوں نے کہا۔ "حفیظ تو نے دوستی کا حق ادا کیا ہے کہ میں اس کا بدلہ ساری عمر نہیں چکا سکتا۔ اس نظم نے دُکھی دلوں کو بہت رُلایا۔ نوجوانوں کے دلوں کی دبی چنگاریاں سُلگ اُٹھیں۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔ حکمران جتنے نے انعام یہ دیا کہ حکم ہو گیا کہ حفیظ کو کوہالہ پار بھیج دیا جائے۔ جب اس کا علم شیخ صاحب کو ہوا تو انھوں نے احتجاج کیا۔ چنانچہ حکم واپس لے لیا گیا۔

"کیا آپ کا شیخ صاحب سے کبھی اختلاف بھی ہوا ؟"

"جب پاکستان بنا تو وہ ریاست کے وزیر اعظم بن گئے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ چنانچہ میں نے کراچی ریڈیو سے ان کے خلاف نظم پڑھی۔ پھر جب انھوں نے ہندستانی حکمرانوں کی مخالفت کی اور قید ہو گئے تو میں آٹھ آٹھ آنسو رویا بھی۔"

پطرس بخاری ایسا طنّاز بھی ان کا معترف تھا۔ انھوں نے ادھر بھی داد دیتی

اُدھر بھی، غرض ہر کہ و مہ ان کا اتنا معترف ہوا کہ صحنِ دل بھر گیا ہوگا۔ اپنا تو یہی خیال ہے ان کی نیّت کا حال اللہ جانے!

پطرس نے بھی لکھا ہے۔ "جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا جو کچھ مدّت سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے۔ جس کے قلم کی ایک بے پرواجنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہوجاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی اور غائب ہوجاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہے۔

ساون رُت، گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہَوا، ہَوا میں اُڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید اور فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن، یہ ایک مستِ کیف شاعر کی وہ دُنیا ہے۔ جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے۔ جب اس کا دل بھر جاتا ہے تو وہ آنسو بہا دیتا ہے۔ جب اس کے دل میں ایک ہُوک اُٹھتی ہے تو وہ اُونچے سُروں میں الاپتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مَسل دیتا ہے۔"

لگے ہاتھوں میں اگر ایک اور بڑے ادیب کی بھی رائے، حفیظ صاحب کے بارے میں پیش کردوں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ میری مراد نیاز فتحپوری سے ہے۔

"سرزمین پنجاب نے دو غیر فانی شاعر پیدا کیے۔ ایک اقبال دوسرا حفیظ، اقبال نے کہا:

خو نے بہ جگر جمع کُن و رنگ بروں آر

حفیظ نے کہا :

نظارہ کن زچاک کتاں ماہتاب را

دُنیا نہ اُسے بھلا سکی نہ لسے !"

میرا خیال ہے کہ اب میں آرا بازی کے سلسلے کو ختم کروں۔ ورنہ یہاں بہت کچھ پیش کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ کون سا ادیب اور شاعر ایسا ہے جس نے حفیظ صاحب کو نہ مانا ہو یا ان کے کلام کو سراہا نہ ہو۔ مگر میں نے حفیظ صاحب کے معاصرین کی آرا، اس لیے بہ طور خاص درج کی ہیں کہ معاصرین سفاک ہوتے ہیں اور ان کے دل خوفِ خدا سے خالی ہوتے ہیں ۔

---

o

پہلے کسی شخصیت پر مضمون لکھنے کے لیے، مجھے اُن کی تصانیف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ زیادہ تر اُن کے عمل اور اُن کی زبان کو پڑھتا تھا۔ جب سے شخصیت کو تحریروں میں پڑھنے کا چسکا پڑا ہے۔ اُس دن سے کتابیں دیکھے بغیر چین نہیں پڑتا۔

حفیظ صاحب کی تصانیف پڑھتے پڑھتے، کبھی کبھی میں ان کے کسی شعر پر نشان بھی لگا لیتا تھا تاکہ ان سے بھی کام لیا جاسکے۔ اقرار کہ میں نے ان کے کلام کو بڑے ہی سرسری انداز میں پڑھا۔ اس کے باوجود کئی شعر ذہن کی کمند میں آگئے۔ دو چار شعر ہوتے تو انھیں کسی نہ کسی طرح کام میں بھی لے آتا۔ اتنے سرسری مطالعہ پر بھی درجنوں ہی اشعار زد میں آگئے۔ اس لیے انھیں ایک ہی جگہ اکٹھا کر دیتا ہوں۔ کیونکہ ان سے بھی کسی نہ کسی طور پر حفیظ صاحب کی شخصیت برآمد ہو رہی ہے۔ کیونکہ ان کے اشعار، ان کی زندگی کے ترجمان ہیں۔ ان کی واردات و سانحات کی تفسیر ہیں۔ لگن اور جدوجہد

کی تعبیر ہیں۔ عمل اور عمل پیہم کی تصویر ہیں۔

"ابھی تو میں جوان ہوں" کے تحت انسان کو جن کیفیات و واردات سے گزرنا پڑتا ہے اُن کا میں نے وانستہ ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ ویسی باتیں محسوس کرنے کی ہوتی ہیں۔ کہنے کی نہیں ہوتیں۔ اشعار نقل کرنے سے پہلے اتنی وضاحت اور کردوں۔ اگر میں شاعری کے نقطۂ نظر سے ان کے شعروں کو چُنتا تو وہ انتخاب قدرے مختلف ہوتا۔ مجھے تو اپنی بیماری، یعنی شخصیت نگاری کے تحت اشعار چننے تھے۔ سو حاضر ہیں:۔

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سُنتا جا شرماتا جا

خبثِ دروں دکھا دیا، ہر دہن غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے، ہنس دیا مسکرا دیا

داغ ہے مجھ پہ عشق کا میرا گناہ بھی تو دیکھ
اُس کی نگاہ بھی تو دیکھ جس نے یہ گُل کھلا دیا

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے
نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

دل کا لازمی تھا یہ نتیجہ
سزا اپنے کیے کی پا رہا ہوں

زندگی سے نپٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے مری بلا جانے

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے

یہ خوب کیا ہے، یہ زشت کیا ہے جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری وفائیں شمار کر لے، مری دغا کا حساب کر دے

کیوں ہجر کے شکوے کرتا ہے کیوں درد کے رونے روتا ہے
اب عشق کیا ہے تو صبر بھی کر اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے

جس نے اس دَور کے انساں کیے ہیں پیدا
وہی میرا خُدا ہو مجھے منظور نہیں

خفگیٔ میکدہ والوں کی ، الٰہی توبہ
کوئی خوش ہو کہ خفا ہو مجھے منظور نہیں

اناڑیوں سے تجھے کھیلنا پڑا اے دوست
سُجھا سُجھا کے نئی چال، مات کھائے جا

میری کوئی خطا نہیں، مجھ سے خفا نہ ہو
اُس بُت کو دیکھ، داورِ محشر خفا نہ ہو

حشر کے دن مجھے سچ کہنے کی توفیق نہ دے
کوئی ہنگامہ بپا ہو مجھے منظور نہیں

ترکِ وفا کیے سے بھی کیا فائدہ حفیظ
اب جب کہ عمر بیت چکی اس گناہ میں

کیا ناخدا بغیر کوئی ڈوبتا نہیں
مجھ کو مرے خدا سے پشیماں نہ کیجیے

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لیے ہوئے دامِ وفا کو میں

اے مصوّر ایک تصویر اس طرح کی کھینچ دے
بارِ دوشِ بیکسی، کوہِ گرانِ زندگی

ان تلخ آنسوؤں کو نہ یوں منہ بنا کے پی
یہ مے ہے خود کشیدۂ اُسے مسکرا کے پی

غم موجود ہے آنسو بھی ہیں، کھا تو رہا ہوں پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں؟ اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا مجھے
اِک اور زندگی کی تمنّا لیے ہوئے

تم ہی نہ سُن سکے اگر، قصّۂ غم سُنے گا کون
کس کی زباں کُھلے گی پھر، ہم نہ اگر سُنا سکے

نہ چلے گی حشر کے دن یہ تری سخن طرازی
کہ تُو نامۂ عمل پر، نہ شہید ہے نہ غازی

یہ مجال تو نہیں تھا مرے دوست، دوست بنتے
مگر اے حفیظ مجھ سے نہ ہوئی زمانہ سازی

آنے والے کسی طوفاں کا رونا رو کر
ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

ابھی باقی ہے میعادِ مصیبت
ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں

اُس کی صورت کو دیکھتا ہوں میں
میری سیرت وہ دیکھتا ہی نہیں

قصۂ قیس سن کے فرمایا
جھوٹ کی کوئی انتہا ہی نہیں

ہل تو یہ سمجھے کہ بُرا شخص نہیں ہے حفیظ
محض عاشق ہی نہیں شاعرِ مشہور بھی ہے

اُسے پڑھ لے کہ ہے افسانۂ دلچسپ حفیظ
کوئی دم میں ہیں یہ اوراق بکھرنے والے

ہر روز جو سمجھانے چلے آتے ہو ناصح
میں پوچھتا ہوں، تم مجھے سمجھے ہوئے کیا ہو

اثر ہو گئے کیوں سات آسماں حائل
ابھی تو ہاتھ اُٹھے ہی نہیں دُعا کے لیے

اللہ اللہ دوست کو میری تباہی پر یہ ناز
سُوئے دشمن دیکھتا ہے داد پانے کے لیے

میری پیشانی پہ اک سجدہ تو ہے لکھا ہُوا
یہ نہیں معلوم ہے کس آستانے کے لیے

مَیں کیا ہوں اس خیال سے آتا ہے ڈر مجھے
کیوں دیکھتے ہیں غور سے اہلِ نظر مجھے

خادم بھی ہوں، خطاؤں پہ نادم بھی ہوں حفیظ
اب اور چاہتے ہیں مرے دوست یار کیا

ہم یہاں دُعا ہی کرتے رہے
وہاں اُس نے جو کہہ دیا ہوگا

تم میرا حال پوچھتے ہو بار بار کیا
اپنی نگاہ پر بھی نہیں اعتبار کیا

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے!
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

مجھے ذلیل نہ کر عذرِ لن ترانی سے
یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے جواب نہیں

جنگ چھڑ جائے ہم اگر کہہ دیں
یہ ہماری زبان ہے پیارے

وہ عندلیبِ گلشنِ معنیٰ ہوں میں حفیظ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

جب عشق ترانہ تھا اب عشق فسانہ ہے
وہ اور زمانہ تھا یہ اور زمانہ ہے

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

چاہوں تو اب بھی جانبِ منزل پلٹ چلوں
گمراہ اس لیے ہوں کہ رہبر خفا نہ ہو

ہر قدم جس کو نئی چال نہ چلنی آئے
وہ تو رہزن بھی نہیں راہنما کیا ہوگا

بغض نے پھونک دیا گلشنِ اُردو کو حفیظ
آنسوؤں سے ترے یہ باغ ہرا کیا ہوگا

جوانی گئی، پھر بھی ہم اور ناصح
جہاں مل گئے چھِڑ گئیں داستانیں

بہت دن گزارے ہیں قیدِ سخن میں
حفیظ آؤ آزاد ہونے کی ٹھانیں

ہم نے روکا حفیظ کو ورنہ اور بھی کچھ لگے تھے فرمانے

آج نہیں تو کل ان میں سے بہت سے اشعار ضرب المثل بنیں گے۔ لیکن افسوس کہ اُس وقت نہ حفیظ ہوں گے اور نہ راقم الحروف، زندگی میں قدر کرنا، زندہ قوموں کا کام ہے۔ ہماری قوم اہلِ ہُنر کو، اہلِ دانش کو، اہلِ علم کو سکون کے ساتھ مرجانے دے تو یہ بھی اس کا کرم ہے۔ یہ بھی اس کا احسان ہے۔ قدردانی کیسی ؟

حفیظ صاحب کی زندگی بڑی ہنگامہ آفریں رہی ہے۔ معرکوں پہ معرکے ہوئے۔ کچھ سر ہوئے، کچھ کے سامنے سپر ڈال دی۔ کچھ میں سُرخروئی حاصل ہوئی۔ کچھ میں خجالت اُٹھائی۔ غرض یہ دُو بدُو کے عالم میں ہمہ وقت رہے۔ میں نے کئی بار سوچا، اگر حفیظ صاحب کو سکون کے ساتھ کام کرنے دیا جاتا تو شاید اس سے بہتر کام کر سکتے۔ مگر اس سے بہتر کام کرنے والی سوچ کو فوراً ہی عقل نے دبوچ لیا۔ "غلط سوچ رہے ہو"۔ اگر حفیظ صاحب کو کوئی چھیڑتا نہیں تو ایسے نغمے کبھی نہ پھوٹتے۔ کوئی جھنجھوڑتا نہیں تو ایسے چوکس کبھی نہ ہوتے۔ کوئی دفن کرنے کی کوشش نہ کرتا تو ایسے زندہ کبھی نہ ہوتے۔

جنھوں نے انھیں تُک بند کہا۔ انھوں نے انھیں شعری زندگی دے ڈالی۔ حفیظ صاحب اپنے مخالفین اور حاسدین سے ناراض ہوں تو ہوں۔ میں تو انھیں حفیظ صاحب کا محسن ہی سمجھتا ہوں۔

انھوں نے بھی، اپنے ایسے ہی حالات و واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے :-
میں نے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے کا آغاز کیا تھا اور ۱۴ جنوری ۱۹۰۸ء کو پنجاب کے ایک پرانے قصبے جالندھر میں پیدا ہوا تھا۔ موجودہ صدی اور میں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو اسی ایک بنا پر شاعری سے بھی بلند گوئی اور بلند دعوئ کر دیتا۔ یہ میرا "احسان" ہے کہ میں شاعر ہونے کا بھی دبی زبان سے ذکر کرتا ہوں۔

دبی زبان سے اس لیے کہ مجھے اپنے ہمعصروں کی چُھری کٹاری سے بہ عذرِ انکسار بچ نکلنے کی تمنّا یا توقع ہے۔ نہیں یہ بازو میرے دیکھے بھالے ہیں۔ یا جو کچھ یہ کہہ سکتے تھے یا کر سکتے تھے۔ کہہ چکے، کر چکے۔ اس سے زیادہ کی توقع ان کی ہمت اور توفیق پر سوءِ ظن ہوگا۔ الّا یہ کہ آموختہ پھر دہرا دیں۔ جس کی گردان ہر خادمِ زبان اور ہر صاحبِ قلم کے بارے میں ان کے قلم اور زبان سے ہوتی رہی ہے"۔

آگے چل کر کہتے ہیں :-

"۱۹۲۲ء میں جب میں نے پہلے پہل روایتی اندازِ سخن سے ہٹ کر اپنے خاص انداز سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اسی وقت سے میرا ان کا سابقہ ہے۔ اس وقت میں تازہ وارد اِن بساطِ ہوائے دل میں سے تھا۔ شعر و سخن کو بہشتِ بریں سمجھ کر "آزارے نہ باشد" کے یقین پر داخل ہوا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ یہاں جنگل کا قانون ہے لیکن مجھے ایسی مخلوق کی بھیڑ بھاڑ میں سے راہ نکالنی پڑی۔ جس کا شعور ابھی تک ڈوبو چینے، تنکا بوٹی کر ڈالنے اور کھا جانے سے آگے نہیں بڑھا۔ باغِ ادب ان کی شکار گاہ ہے۔

مجھے ان کے اکّے دکّے سے دوچار ہونا پڑا۔ ٹولیاں بھی مجھ پر پکیں جھپٹیں ــــ ان سے بچنے کے لیے صرف ایک ہتھیار درکار ہے۔ بے پروا مسکراہٹ!"

اس موضوع پر ان کا ایک شعر بھی تو ہے ؎

خبثِ دروں دکھادیا، ہر دہنِ غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے، ہنس دیا مُسکرا دیا

حفیظ صاحب کے مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ بڑے اللہ والے ہوں۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بے شک انھوں نے بے پروا مسکراہٹوں سے بھی جواب دیا ہوگا۔ مگر ادبدا کے ٹوٹ پڑنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ جس نے جس طرح ان سے نپٹنا چاہا۔ انھوں نے اُسے اُسی طرح پچھاڑا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں کہنا پڑا ؎

زندگی سے نپٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے مری بلا جانے

ان کے خلاف ان کے "ہم صوبہ" بھی تھے۔ جو ان کی ہر دلعزیزی سے خوفزدہ تھے اور وہ بھی جنھیں اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ رہا ہے ؎

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

اب بات سمجھ میں آتی ہے۔ یہ اُن مخالفین پر مسکراتے ہوں گے۔ جن کے بارے میں ان کا ارشاد ہے ؎

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

آج کل حفیظ صاحب کا یہ عالم ہے کہ آتے ہیں تو دُور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہیں سے سلام کرتے ہیں۔ پھر وہیں کھڑے رہتے ہیں۔ پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد قدم بڑھاتے ہیں۔ مسکراتے اور پھر جان دار طریقے سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر، ہاتھ کے اشاروں سے، خاموشی کی زباں میں حال احوال پوچھتے ہیں۔

اسی شان کے ساتھ ایک دن تشریف لائے تو کہنے لگے۔ جو کچھ انھوں نے کہا۔ وہ میں نہ سُن سکا۔ صرف اُن کے ہونٹ ہلتے رہے۔

اب میں ان کی خاموش گفتگو کا کیا جواب دیتا۔ کھسیانا ہو کر اُن کا منہ تکنے لگا۔ انھوں نے پھر خاموش گفتگو کی۔ ظاہر ہے کہ میرے پاس، اُن کی اس بات کا بھی کوئی جواب نہ تھا۔

پھر ان کے وہ الفاظ جو میں نے سُنے یہ تھے "نہ کہنا!"

اب میں حیران کہ کیا نہ کہوں۔ لیکن جواب میں، مَیں نے کہہ دیا "بہت اچھا!"

"اُس سے میں نے خود تھوڑے کی تھی"

"کیا؟"

"شادی!"

"اچھا اچھا!"

اُس نے مجھے خود ڈھونڈا۔ شادی کی۔ کیونکہ اُسے مجھ سے زیادہ بیوقوف اور کوئی نہیں ملا تھا۔"

میں نے اُن سے نہیں پوچھا کہ وہ کون سی شادی کا ذکر کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اُس وقت اتنے آزردہ تھے کہ اگر میں تفصیلات میں چلا جاتا تو چھلک جاتے۔

وہ پھر گویا ہوئے۔ "ایک مشورہ دوں؟"

"ارشاد!"

"اِس عمر میں، جس میں کہ اس وقت تم ہو۔ لوگ عموماً دوسری شادی کرتے ہیں۔ تم اپنے سینے میں چھُرا گھونپ لینا مگر دوسری شادی نہ کرنا۔ تم بُرا کام کر لینا، مگر شادی نہ کرنا۔"

"بہت اچھا۔"

"میری باتیں کان کھول کے سُنی ہیں نا؟"

"جی ہاں! شادی نہ کرنے کے سلسلے میں، جتنی رعایتیں آپ نے دی ہیں۔ اُن کی موجودگی میں جو بھی شادی کرے گا، بے وقوف ہی ہوگا۔"

ایک موقع پر انھوں نے فرمایا۔ "میں پچھلے مہینے بھی آیا تھا معلوم ہوا آپ کراچی گئے ہوئے تھے۔ اس ماہ کے شروع میں بھی آیا تو معلوم ہوا کہ دوبارہ کراچی گئے ہیں۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں!"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کراچی لاہور سے سینکڑوں میل دُور ہے۔ محض نفقہ بجاً تو کوئی بار بار نہیں جا سکتا۔" یہ تو ٹھیک ہے۔

"ٹھیک ٹھیک کیوں نہیں بتاتے۔ پہیلیوں میں بات کیوں کرتے ہو؟"

"دریوزہ گری کے لیے گیا تھا۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ معلوم ہوا۔ ان کے سینے میں چوٹ لگی، بیکل ہوئے۔ "طفیل! ہم سب کا یہی انجام ہے۔ یہی انجام!"

"میں تو اللہ کا شکرادا کرتا ہوں کہ خوش پوشی اور بھرم دونوں چل رہے ہیں۔ مگر جب اچانک کوئی بڑی ضرورت۔ پڑجاتی ہے تو پھر دوستوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔"

"میرا جی چاہتا ہے کہ آج تمھیں اپنی مالی حالت کے بارے میں بھی کچھ بتاؤں کراچی کے ایک اخبار کے ایڈیٹر نے میرے ایک عزیز سے کہا، حفیظ تو لاکھوں کے مالک ہیں۔ انھوں نے ہر حکومت کو لُوٹا۔ صرف بھٹو حکومت نے گھاس نہیں ڈالی۔

میں نے دبے لفظوں میں کہا، "آپ کی امارت کے چرچے تو بہت ہیں۔"

"طفیل!"

"جی!"

"طفیل!"

"جی!"

"لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ! میں قرضخواہ ہوں۔ چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ سے

حساب لے لے۔"

حفیظ صاحب دُبلے پتلے تو پہلے بھی تھے مگر اب نقاہت اور لاغری کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ بے حد چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ بات بات پر جھنجلا اُٹھتے ہیں بلکہ گالی تک دے دیتے ہیں۔ خلافِ طبیعت کوئی بات ہوئی نہیں اور یہ اُڑے نہیں۔ پہلے آدم بیزار تھے اب آدم آزار ہیں۔

گو ان کی طبیعت کا طنطنہ تو پہلے بھی تھا۔ بڑے بڑوں کو جھاڑ پلا دیتے تھے۔ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مگر اُن دنوں یہ کسی بات پر ناراض ہوتے تھے آج بے بات پر ناراض ہوتے ہیں۔ وہ تقاضا خون کا تھا۔ یہ تقاضا عمر کا ہے۔

ان کی ایک آنکھ بالکل بے کار ہو چکی ہے۔ اس میں سے کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر عینک رنگا کر اور اس میں ایک قدرے میلا شیشہ جڑ کر، خود کو بھی دھوکا دیتے ہیں اوروں کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔

ایک دن حفیظ صاحب نے فرمایا "آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اپنی غزلوں اور نظموں کے آخری مجموعے کا کیا نام رکھا ہے؟"

"نہیں معلوم۔"

"خدا حافظ!"

پچھلے دنوں حفیظ صاحب تشریف لائے تو بے حد افسردہ اور مغموم تھے۔ ویسے خوش تو میں نے انھیں کبھی دیکھا ہی نہیں مگر اُس دن کچھ "ضرورت" سے زیادہ ہی

پریشان تھے - فرمانے لگے - آج ایک نظم کہی ہے - وہ سنو!"

حفیظ صاحب نے بغیر فرمائش کے کبھی شعر نہیں سنائے - کم از کم مجھے نہیں سنائے - اس لیے مجھے اُن کے ارشاد پر اچنبھا ہوا - میں نے کہا "ضرور فرمائیے۔"

فرمانے لگے "اپنی ذات کے بارے میں نظم کہی ہے - قوم اور حکومت نے مجھے جس نہج تک پہنچا دیا ہے - اس کا اظہار کیا ہے - اس کے بعد اُن کی آواز گلوگیر ہو گئی، اور اُنھوں نے تحت اللفظ یہ نظم سنائی :

نہ عقل کا تجھے سودا نہ عشق کا آزار

حفیظ کیوں نظر آتا ہے تو نحیف و نزار؟

اُبلتے کیوں ہیں یہ آنکھوں سے گرم گرم آنسو

لرز رہا ہے بدن ، جیسے آرہا ہو بخار!

جمی ہیں کیوں ترے ہونٹوں پہ سرد سرد آہیں

یہ زرد زرد سا چہرہ ، جنوں کے ہیں آثار

تو آسماں کو تکتا ہے کیوں لجاجت سے

ترے دہن پہ ہے کیوں ہائے ہائے کی تکرار

شراب کا نہیں عادی ، قمار باز نہیں

سمجھتے ہیں تجھے کیوں اہلِ بزم بد اطوار

ترے چلن سے تھے مایوس والدین ترے

ترے عزیز، تری شکل سے بھی تھے بیزار

یہ قافیے یہ ردیفیں، گھڑنت اور پڑھنت
ملیں نہ جن کے عوض تجھ کو دو ٹکے بھی اُدھار
اُدھیڑ بُن یہ خیالی ، ملال بد حالی
خزاں میں تازہ بہاروں کے "رنگ دار" افکار
یہ جوڑ توڑ یہ لفظوں کے مول تول کے بول
یہ سرد مہریٔ یاراں میں گرمیٔ بازار
ترے شباب کا تا شکیب یہ مسلسل عیب
سروشِ غیب ہے یا تجھ پہ ہے خدا کی مار
یہ جن کے واسطے لب پر ہے تیرے نعرۂ حق
چڑھائیں گے یہی "منصور" تجھ کو بر سرِ دار
وہ دیکھ تیری بہتر برس کی راہوں کا
ہے محتسب، ملک الموت، قافلہ سالار

اس نظم کا مجھ پر بھی اِتنا شدید ردِ عمل ہوا کہ خاصا پریشان ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے حالات ایسے نہیں۔ جیسے کہ نظم ہو گئے۔ اس کے باوجود میرا سوال یہ ہے کہ ایک شاعر کو، وہ بھی اتنے عظیم شاعر کو ایسے احساسات نے گھیرا کیوں، ضرور کچھ محرکات بھی ہوں گے۔

حفیظ صاحب کی کوٹھی ماڈل ٹاؤن میں ہے۔ میرا اُدھر جانا نہیں ہوتا۔

فاصلہ جو ہوا۔ وہ شہر آتے ہیں تو حسبِ معمول مجھے بھی جھانک جاتے ہیں۔ کسی ایسے ہی پھیرے میں آئے تو میں نے پوچھا! "خیریت ؟"

"اب خیریت کہاں۔ بینائی جاتی رہی۔ ٹھیک سے نظر نہیں آتا۔ دانت سارے نکل گئے۔ چلنے پھرنے میں بھی تھکاوٹ ہوتی ہے۔ اب تو یہ ہے کہ کسی دن تجھے میرے بارے میں دو لفظ لکھنے پڑ ہی جائیں گے۔"

اسے پڑھ لے کہ ہے افسانۂ دلچسپ حفیظ
کوئی دم میں ہیں یہ اوراق بکھرنے والے

میرے ایک دوست نے کہا تھا "تصنع کے بغیر، ان کی شخصیت صفر ہے۔" میں کہتا ہوں حفیظ صاحب کی شخصیت میں جتنی بھی دلکشی ہے وہ ان کے تصنع ہی کی بدولت ہے۔ تصنع بھی ایسا، جسے عطیۂ خداوندی کہنا چاہیے۔ کیونکہ اکتسابی تصنع کو اتنی مقدار میں مہیا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یا پھر جسے میں اور آپ تصنع کہتے ہیں وہ تصنع نہ ہوگا بلکہ کوئی وصف ہی ہوگا۔ جو ان کی شخصیت میں حلول ہو کر، اخلاق کا درجہ حاصل کر گیا ہوگا اور اخلاق بھی ایسا، جس پر مخاطب جتنا بھی شرمندہ ہو کم ہے۔